بستیاں بسے بستے بستی ہیں لیکن بچہ شاہ کی بستی جیسے پلک جھپکنے میں آباد ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ پہلے وہاں کچھ بھی نہ تھا' نہ کوئی آدم زاد اور نہ کوئی چرند وپرند نظر آتا تھا۔ ایک ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ وہاں سے گزرنے والے بھولے بھٹکے مسافر اس ٹھنڈے میٹھے چشمے سے اپنی پیاس بجھاتے تھے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہاں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ نہ کوئی جھونپڑی اور نہ ہی کوئی سایہ دار درخت تھا۔ ایسا ہی ویران علاقہ بچہ شاہ کی بستی کے نام سے آباد ہو گیا تھا۔

وہ بستی آزاد علاقے کی سرحد پر واقع تھی یعنی اس بستی کے مشرق کی طرف وہ ملک تھا جہاں قانون کا بول بالا تھا اور مغرب میں وہ آزاد علاقہ تھا جہاں قانون سے کھیلا جاتا ہے۔ جب کوئی مجرم کسی کو قتل کر کے قانون سے دور بھاگنے کے لئے جائے پناہ تلاش کرتا تو وہ سیدھا اس بستی سے گزرتا ہوا آزاد علاقے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں قانون کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اسی طرح آزاد علاقے میں جب قبائلی آپس میں لڑتے تھے اور کوئی کسی کے انتقام سے بچنا چاہتا تھا تو قانون کی پناہ میں آنے کے لئے اس بستی سے گزر کر مشرقی ملک میں چلا آتا تھا۔ اسی طرح آنے جانے والوں نے رفتہ رفتہ اس ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے کے پاس پڑاؤ ڈالنا شروع کیا۔ کچھ ضرورت کا سامان لاکر رکھا تاکہ گزرنے والے خرید کر کھا سکیں' پی سکیں' کچھ دیر ستا سکیں۔ اس کے بعد آگے چل پڑیں۔

اس وقت اس جگہ کو بچہ شاہ کی بستی نہیں کہا جاتا تھا۔ وہ محض ایک پڑاؤ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بستی کا سہرا ایک شاہین کے سر ہے۔ پتہ نہیں وہ شاہین کہاں سے اڑتا ہوا اس پہاڑی علاقے میں آیا تھا اور اپنی مادہ کے ساتھ اس چشمے کے کنارے ٹھہر گیا تھا۔ اس کی مادہ نے وہاں انڈے دیئے تھے۔ پھر ان انڈوں میں سے ایک بچہ صحیح

سلامت نکلا تھا۔ اسی وقت کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز اس ویرانے میں گونجنے لگی۔ شاہین کی مادہ نے سر اٹھا کر پہاڑ کے نیچے دیکھا۔ چٹان کے سائے سے وہ آواز ابھر رہی تھی۔

وہاں بھی ایک انسانی جوڑا کہیں سے بھٹکتا ہوا آیا تھا اور عورت نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ پہاڑ کی بلندی پر بیٹھے ہوئے شاہین نے اپنی شاہینہ کو دیکھا۔ (شاہین کی مادہ کو شاہینہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے بار بار مادہ کہنے سے قوم کا اخلاق بگڑ جاتا ہے۔) پرندے شاید ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں۔ شاہین شاید وہاں سے اڑ کر اس چٹان پر جانا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ کس نے کس کو جنم دیا ہے؟ لیکن شاہینہ نے شاید اپنی کسی حرکت سے اسے روک دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا مرد پرائی عورت کو دیکھنے جائے۔ اس لئے وہ شاہین کو اپنے بچے کے پاس چھوڑ کر خود پرواز کرتی ہوئی اس چٹان پر پہنچی۔ وہاں چٹان کے سائے میں ایک عورت اپنے بچے کو بازو میں لئے ہوئے لیٹی تھی اور ایک مرد ہاتھ میں رائفل لئے یوں چوکس کھڑا ہوا تھا جیسے کسی لمحے کسی دشمن کے آنے کا خطرہ ہو۔

چشمے سے ذرا دور ایک ہندو بنئے نے جھونپڑی ڈال رکھی تھی اور وہاں اپنے خاندان کے ساتھ آباد تھا۔ اس نے کھانے پینے کا بہت سامان شہر سے لاکر رکھا تھا۔ اس کے پاس مویشی بھی تھے وہ دودھ بھی فروخت کرتا تھا۔ وہاں سے گزرنے والے اسے اچھے دام دے کر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیتے تھے۔ وہاں کچھ دیر قیام کرتے تھے اور پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔ بنئے نے جب بچے کے رونے کی آواز سنی تو جھونپڑی سے نکل کر باہر آیا۔ پھر ایک چٹان کے سائے میں ایک شخص کو رائفل کے ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہیں سے چیخ کر بولا۔ ''جوان! میری طرف رائفل نہ اٹھانا۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گا۔ یہاں کھانے پینے کی چیزیں ہیں اور تمہاری عورت اور نوزائیدہ بچے کے لئے بھی بہت کچھ مل جائے گا۔ تازہ دودھ بھی فراہم کردوں گا۔ میں یہاں سے گزرنے والے ہر چہرے کو پہچانتا ہوں۔ اگر تم قانون کی طرف سے مفرور ہو تو آگے جانے کے لئے آزاد علاقہ تمہارے سامنے ہے اور اگر آزاد علاقے سے کسی کو قتل کر کے آئے ہو تو مشرق کی طرف تمہیں قانون کی پناہ مل جائے گی۔ یہاں اپنی بیوی اور

بچے کے ساتھ تھوڑی دیر قیام کرو اور پھر اپنی منزل کا تعین کرو۔"

وہ اپنی منزل کا تعین نہ کرسکا۔ اس کی بیوی کی حالت بہت خراب تھی۔ بچہ تندرست تھا مگر بیوی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ وہاں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں تھا جو اسے معقول دوائیں دیتا اور اس کی جان بچاسکتا۔ دو دنوں تک وہ شخص بہت پریشان رہا۔ کبھی بچے کا خیال کرتا تھا' کبھی بیوی کو تسلیاں دیتا تھا۔ جب دوائیں نہ ہوں تو صرف تسلیاں ہی دی جاتی ہیں۔ وہ ہمیشہ رائفل اٹھائے دور دور تک نظریں دوڑاتا رہتا تھا۔ رات کے وقت سو نہیں سکتا تھا۔ چونک کر اٹھ جاتا تھا جیسے قانون کے ہاتھ اسے گرفت میں لینے آرہے ہوں۔

بنئے نے اپنی جھونپڑی کے پیچھے ایک اور جھونپڑی بنائی تھی وہاں سے گزرنے والے کو وہ رہنے کی جگہ دیتا تھا اور ان سے ایک دن کا ایک روپیہ وصول کیا کرتا تھا۔ وہ شخص اپنی بیوی اور بچے کو لے کر اسی جھونپڑی میں آگیا۔ شاہینہ اگرچہ انسان نہیں تھی لیکن اس کے اندر بھی ممتا تھی۔ وہ اپنے بچے کو دانہ کھلاتی تھی اور کبھی پرواز کرتے ہوئے اس جھونپڑی کی چھت پر آکر بیٹھ جاتی تھی جہاں وہ بیمار عورت اپنے بچے کے ساتھ آخری سانس لے رہی تھی۔ شاہینہ کی بے چینی اس سے ظاہر ہوتی تھی کہ وہ اکثر راتوں کو اس جھونپڑی کے پاس آتی تھی۔ اس عورت کی کچھ مدد نہیں کرسکتی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے اس کی عیادت کے لئے آتی رہتی ہو۔

تیسرے دن بچے کو جنم دینے والی وہ عورت مرگئی۔ اس کے شوہر نے دور ایک جگہ اسے دفن کردیا۔ اب وہ بچہ اس مفرور کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ بنئے نے اسے سمجھایا۔ "تم قانون سے بھاگ کر آئے ہو اور تمہارے لئے وہی ایک آزاد علاقہ ہے جہاں قانون سے بچ کر رہ سکتے ہو۔ ویسے سنا ہے کہ آزاد علاقے میں بیگار کیمپ ہے۔ جو لوگ قانون کی زد سے نکل کر وہاں جان بچانے کے لئے جاتے ہیں' اس بیگار کیمپ میں پھنس جاتے ہیں۔ وہاں ان سے اتنی محنت کرائی جاتی ہے اتنی محنت کرائی جاتی ہے کہ جسم سے پسینے کی جگہ خون بہنے لگتا ہے۔"

اس مفرور نے سوچا کہ پولیس والے آئیں گے تو ان سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے لیکن بیگار کیمپ میں جاکر پھنسنا دانشمندی نہیں ہے لہٰذا وہ اسی جگہ اپنے لئے ایک

جھونپڑی بنانے لگا۔ ننھا سا بچہ بہت پریشان کرتا تھا۔ اسے جھونپڑی بنانے کے لئے محنت بھی کرنی پڑتی تھی اور بچے کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اسے بوتل سے دودھ بھی پلانا پڑتا تھا۔ اس لئے وہ جس جگہ جھونپڑی بنا رہا تھا اسی جگہ بچے کو بھی کہیں کسی پتھریلی جگہ لٹا دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے جھونپڑی کی دیواریں کھڑی کرنے کے دوران سوچا کہ بچہ بہت دیر سے نہیں رو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ یہ بچے کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس نے پلٹ کر دور پڑے ہوئے بچے کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بچہ دھوپ میں پڑا ہوا تھا لیکن اسے دھوپ نہیں لگ رہی تھی۔ شاہینہ اس کے سرہانے بیٹھی اپنے دونوں پر پھیلائے ہوئے اس پر سایہ کررہی تھی۔ ہماری دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ماں مرجاتی ہے ممتا کبھی نہیں مرتی۔ اس وقت کم از کم یہی ثابت ہو رہا تھا کہ ممتا کا درد انسان اور حیوان میں مشترک ہوتا ہے۔

دونوں بچے چالیس دن کے ہوگئے۔ شاہینہ کا بچہ اپنی پناہ گاہ سے باہر اب چلا آتا تھا اور ادھر ادھر پھدکتا تھا لیکن اس مفرور کا بچہ ابھی چلنے کے قابل نہیں تھا۔ لیٹے ہی لیٹے ذرا کروٹ بدل لیتا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک اور شخص کہیں سے بھاگتا ہوا وہاں چلا آیا۔ اس کے پاس بھی ایک رائفل تھی مفرور نے آنے والے کو دور ہی سے للکارا۔

"رک جاؤ' کون ہو تم؟"

آنے والے شخص نے ایک چٹان کی آڑ لے کر محاذ بناتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں آزاد علاقے سے آرہا ہوں۔ دشمن میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ مجھے پناہ کی تلاش ہے۔ میں یہاں ذرا دیر دم لوں گا۔ پھر آگے چلا جاؤں گا۔"

بنیا ان کے درمیان آکر بولا۔ "تم لوگ آپس میں نہ لڑو۔ میں یہاں سے گزرنے والوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ آنے والا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میری دکانداری خراب نہ کرو۔ میرا گاہک ہے میری دکان سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدے گا۔ اگر چاہے گا تو ایک آدھ دن میرے یہاں کرایہ ادا کرکے رہے گا۔"

بنئے نے اپنے منافع کی خاطر دونوں کے درمیان دوستی کرادی۔ وہ آنے والا ایک قاتل تھا۔ آزاد علاقے میں اپنے ایک دشمن کو قتل کرکے آیا تھا۔ اب کوئی

دوسری پناہ گاہ تلاش کر رہا تھا۔ کیونکہ مقتول کے رشتہ دار اب اسے قتل کرنے کے لئے تلاش کر رہے تھے۔

شام آنے سے پہلے ہی وہ تعاقب کرنے والے اس کے سر پر آن پہنچے۔ اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ مفرور نے پہاڑی کے ایک اونچے حصے پر محاذ بنالیا تھا اور دشمنوں کو بھگانے کے لئے وہاں سے فائرنگ کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے جوابی فائرنگ ہو رہی تھی۔ شاہین اور شاہینہ پہاڑ کی بلندی پر تھے۔ ان سے نیچے پناہ گاہ میں ان کا بچہ تھا جو وہاں سے پھدکتا ہوا چٹان پر آگیا تھا۔ اسی وقت ایک گولی اس بچے کو آکر لگی شاہینہ چیخ مارتے ہوئے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے پہاڑی کی بلندیوں سے اڑنے لگی اور فائرنگ کرنے والوں کے سروں پر چکرانے لگی۔ وہ کبھی اپنے بچے کے پاس آتی تھی اور کبھی ان دشمنوں کے سر پر پہنچ جاتی تھی۔ پہلے شاہین نے انتقامی حملہ کیا' ایک رائفل بردار کی آنکھ نکال کر لے گیا۔ دوسری بار شاہینہ نے ایک دشمن پر حملہ کیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل گری تو وہ اپنی نوکیلی چونچ سے اس کے چہرے کا گوشت نوچ کر اڑ گئی۔ ایک رائفل بردار نے ان کا نشانہ لینا چاہا لیکن وہ جوڑا پرواز کرتے ہوئے چٹانوں کی آڑ میں چلا گیا۔

وہ مفرور اپنے بچے کو لے کر اپنی بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ تب ہی وہاں فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس کو دوسرے قاتل کے دشمن آپہنچیں گے اور اس انداز میں فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ وہ اپنے بچے کو لے کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑتے ہوئے ایک ٹیلے کی طرف جانے لگا۔ اسی وقت یکے بعد دیگرے دو گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں اور اس کے ساتھ بچے کو بھی چاٹ گئیں۔ شاہینہ چیختے ہوئے پھر چٹان کے پیچھے سے نکلی۔ دیوانہ وار پرواز کرتے ہوئے اس بچے کی طرف جانے لگی۔ اس کے پیچھے شاہین بھی لپکا۔ شاید وہ اپنی شاہینہ کو ایسے وقت پرواز کرنے سے منع کرنا چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں پرواز کرتے ہوئے اس بچے کے قریب پہنچے ایک اندھی گولی شاہین تک پہنچ گئی۔ وہ بے چارہ پھڑپھڑاتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

وہ خون خرابے والا منظر سوگوار ہو چکا تھا۔ اب ان کی فائرنگ کا جو بھی انجام ہو

مگر ادھر دو خاندان تباہ ہو چکے تھے۔ ایک خاندان انسانی تھا' دوسرا حیوانی۔ انسانی خاندان میں مفرور کی پہلی بیوی مری تھی' اب بچہ بھی انتقامی جنون کا شکار ہو گیا تھا حیوانی خاندان میں شاہین اپنی شاہینہ کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر اپنے بچے کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔

شاہینہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ چونچ کھلی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں' جیسے رو رہی ہو ماتم کر رہی ہو اور فریاد بھی کر رہی ہو لیکن نہیں جو انتقام لینا جانتے ہیں وہ کسی سے فریاد نہیں کرتے۔ وہ جوش اور جنون میں وہاں سے تڑپ کر پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اٹھی۔ فضا میں پرواز کی۔ پھر بلندی اور بلندی پر جاتے ہوئے دشمنوں کے سروں پر پرواز کرنے لگی۔ کبھی وہ چٹانوں کے پیچھے چھپتی تھی' کبھی دشمنوں پر حملے کرتی تھی۔ پھر خود کو بچا کر نکل جاتی تھی۔ ایک رائفل بردار نے اس پر فائرنگ کرنا چاہی تو جواباً مفرور نے گولی چلا دی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اب چار میں سے ایک دشمن رہ گیا تھا۔ وہ اکیلا دشمن دو طرفہ حملوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ایک طرف سے وہ مفرور فائرنگ کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے شاہینہ چٹانوں کے پیچھے سے نکل کر اس پر حملہ کرتی تھی' جھپٹتی تھی' پلٹتی تھی' پلٹ کر پھر جھپٹتی تھی اور روپوش ہو جاتی تھی۔

وہ تنہا مقابلے پر ٹھہر نہ سکا۔ وہاں سے بھاگنے لگا۔ بھاگنے کے دوران ہی اسے ایک گولی لگی اور وہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ تمام کا قصہ تمام ہو گیا۔ صرف وہ قاتل رہ گیا جسے مارنے کے لئے وہ دشمن آئے تھے اور خود مر گئے تھے۔ اس نے خوشی کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے محاذ سے نکلتے ہوئے ان کی لاشوں کے پاس آکر دیکھا۔ دو دشمن ایسے تھے جن میں سے شاہینہ نے ایک کی آنکھ نکال لی تھی اور دوسرے کے چہرے کا گوشت نوچ لیا تھا۔ دونوں زخموں کی تاب نہ لا کر دم توڑ رہے تھے' زمین پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اس نے ان دونوں کو گولی مار دی۔

اب لڑائی کو ختم ہونا چاہئے تھا لیکن شاہینہ پھر چٹان کے پیچھے سے اٹھی' چیختی ہوئی' پرواز کرتی ہوئی اس مفرور کی طرف آئی۔ وہ بوکھلا گیا۔ وہاں سے بھاگنے لگا۔ شاہینہ کی رفتار تیز تھی۔ وہ مفرور کے اس ہاتھ پر جھپٹی جس میں اس نے رائفل پکڑی

ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گر پڑی۔ شاہینہ نے اسے نقصان نہیں پہنچایا۔ واپس بلندی پر پرواز کرتی ہوئی پھر اس کے سر پر منڈلانے لگی۔ وہ بنئے کی جھونپڑی کے پاس آکر رک گیا تھا اور خوفزدہ ہو کر شاہینہ کو دیکھ رہا تھا۔

بہت دور اس کی رائفل زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ہتھیار کی طرف بڑھنے لگا۔ شاہینہ پھر بلندی سے پستی کی طرف آئی اور اس کی طرف جھپٹنے لگی۔ وہ دوبارہ پلٹ کر بھاگتا ہوا بنئے کی جھونپڑی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہینہ اس بار بلندی پر پرواز کرنے کی بجائے رائفل کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

بنیا اپنے خاندان والوں کے ساتھ اپنے گھر میں چھپا ہوا تھا اور کھڑکی سے جھانک کر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا اس نے قاتل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "او بھائی! جانوروں کی زبان نہیں ہوتی۔ وہ اپنی حرکتوں سے اپنی بات سمجھا دیتے ہیں۔ وہ مادہ چوٹ کھائی ہوئی ہے اندر سے زخمی ہے' کسی کو ایسے ہتھیار کے پاس نہیں جانے دے گی۔ جس سے اس کا نر اور اس کا پیارا سا بچہ مارا گیا ہے۔ تم اس رائفل کو ہاتھ نہ لگاؤ' اسے چھوڑ دو۔"

قاتل نے بنئے سے کہا۔ "کاکے جی! یہ رائفل سوتے جاگتے میرے ساتھ رہتی ہے۔ پتہ نہیں کوئی اور دشمن ادھر آنکلے تو کیا ہو گا؟"

"جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ ابھی تو کوئی دشمن نہیں آئے گا جب اس مادہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے' یہ پُرسکون ہو جائے تو چپ چاپ اپنی رائفل اٹھا لینا۔ ابھی ان بے چاروں کے کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔ تم اگر اس مادہ کو نہیں چھیڑو گے۔ اپنی رائفل کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے تو میں باہر آؤں گا' ورنہ تمہاری حرکتوں سے خطرہ بدستور رہے گا۔"

اس نے وعدہ کیا کہ اب رائفل کی طرف نہیں جائے گا۔ بنیا اپنی جھونپڑی سے باہر آگیا۔ پھر وہ لوگ ایک کدال اور بیلچہ لے کر ان لاشوں کے پاس آئے۔ شاہینہ رائفل کے پاس سے پرواز کرتے ہوئے پہاڑی کے اس حصے پر گئی جہاں اس کے بچے کی خون آلود لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بچے کو پنجے میں دبوچ لیا۔ اسے لے کر فضا میں بلند ہو گئی۔ اِدھر سے اُدھر پروں کو پھیلائے ہوئے پرواز کرتی رہی جیسے اپنے

بچے کو آخری بار دنیا دکھا رہی ہو۔ اپنی حسرت پوری کر رہی ہو کہ میرے بچے! تو زندہ ہوتا تو میں تجھے اسی طرح پرواز کرنا سکھاتی۔"

وہ کیا سوچ رہی تھی؟ کیا سمجھ رہی تھی؟ کوئی نہیں جانتا بنیا اپنے طور پر سوچتا تھا کہ جانوروں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں اور یہ جذبات سب ہی سے ظاہر ہوں یا نہ ہوں لیکن مادہ پرندوں اور جانوروں میں ممتا کی وجہ سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ شاہینہ تھوڑی دیر تک اور دور تک پرواز کرتے رہنے کے بعد اپنے بچے کو لے کر اس انسانی بچے کے پاس آئی جس کی لاش بھی خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بچے کو اس بچے کے پاس لا کر ڈال دیا۔

بنئے نے کہا۔ "یہ چاہتی ہے کہ یہ دونوں بچے ایک جگہ رہیں۔ اس لئے ہم ان دونوں کو ایک ہی گڑھے میں' میرا مطلب ہے ایک ہی قبر میں دفن کر دیں گے۔"

یہی کیا گیا۔ انسانی اور حیوانی بچوں کی ایک مشترکہ قبر بنا دی گئی۔ ان کے باپ کو الگ ایک گڑھے میں دبا دیا گیا۔ وہاں دوسرے دشمنوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے لئے بھی ایک بڑا سا گڑھا کھودا گیا۔ وہ قاتل چاہتا تھا کہ انہیں دفن کرنے کے بعد ان کی رائفلیں اپنے پاس رکھ لے لیکن جب وہ رائفلوں کو ہاتھ لگانے لگا تو شاہینہ پھر بھڑک گئی۔ پھر پرواز کرتی ہوئی آئی اور اس پر جھپٹنے لگی۔ بنئے نے چیخ کر کہا۔ "بھائی کیا کرتے ہو؟ ان رائفلوں سے دور رہو یا ان ہتھیاروں کو ان لاشوں کے ساتھ دفن کر دو۔"

لیکن وہ رائفلوں کو دفن کرنے کے لئے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگا سکا۔ جب بھی ان کے قریب جاتا تھا' شاہینہ اس پر جھپٹنے لگتی تھی۔ مجبوراً صرف ان لاشوں کو دفن کرنا پڑا۔ وہ چاروں رائفلیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑی ہوئی تھیں۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کسی کو ہاتھ لگا سکتا۔ اس کی اپنی رائفل بنئے کی جھونپڑی کے سامنے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر پڑی تھی۔ اسے بھی وہ اٹھا نہیں سکتا تھا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ "کاکے جی! یہ تو بڑی مشکل ہو گئی ہے۔ کیا میں اپنی رائفل بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکوں گا۔ یہ تو میری دشمن بن گئی ہے۔"

بنئے نے کہا۔ "صرف تمہاری نہیں بلکہ ہر اس شخص کی دشمن بن جائے گی جو

ان رائفلوں کو ہاتھ لگائے گا۔"

وہ ایک اونچی چٹان پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہاں سے اسے بچوں کی قبر نظر آتی تھی اور وہ پانچوں رائفلیں بھی نظروں میں رہتی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ نگرانی کر رہی ہو اور کسی کو بھی وہاں جانے سے پہلے روک دینا چاہتی ہو۔ رات کو جب تاریکی چھا گئی اور بہت رات گئے جب یہ یقین ہو گیا کہ وہ سو گئی ہو گی تو وہ قاتل اس جھونپڑی سے باہر نکلا جسے مفرور نے تعمیر کیا تھا۔ وہاں سے وہ دبے قدموں چلتا ہوا اپنی رائفل کی طرف جانے لگا۔ اسی وقت اچانک ہی پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی اسے محسوس ہوا کہ کبھی اس کے دائیں، کبھی بائیں، کبھی آگے، کبھی پیچھے پر پھڑپھڑا رہے ہیں۔ وہ ایک دم سے دہشت زدہ ہو کر الٹے قدموں بھاگتا ہوا پھر اپنی جھونپڑی کے اندر آ گیا۔

وہ رات بھر پریشان رہا۔ چین سے سو نہ سکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس قسم کا پرندہ ہے۔ دن بھر وہ بچے کے صدمے سے نڈھال رہی۔ رات کو بھی نہیں سو رہی تھی اور رائفلوں کی طرف جانے والے قدموں کی آہٹ سن لیتی تھی۔ وہ کب تک جاگتی رہے گی؟ کب تک غم کھاتی رہے گی؟ اس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔

دوسرے دن بنّے نے اسے سمجھایا۔ "رائفل کے لئے پریشان کیوں ہوتے ہو؟ وہ تو تمہاری نگاہوں کے سامنے زمین پر پڑی رہتی ہے، کوئی دوسرا اسے اٹھانے نہیں آئے گا۔ اطمینان رکھو! کبھی نہ کبھی تم اسے اٹھا ہی لو گے۔"

مگر وہ اٹھانے والا دن نہیں آیا۔ ایک دن گزر گیا۔ دو دن گزر گئے۔ دس دن گزر گئے۔ ایک اور رائفل بردار گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرنے کے لئے آیا۔ ابھی وہ چشمے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا کہ شاہینہ نے چٹان کی بلندی پر سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ آنے والے پر اعتراض نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ رائفل تھی۔ وہ ایک دم سے چیختی ہوئی۔ پرواز کرتی ہوئی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر تو وہ سوار بوکھلا گیا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر رائفل اپنے شانے سے اتارنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے ہی شاہینہ اس پر جھپٹ پڑی۔ دوسرے ہی لمحے جب وہ ان کے پاس سے گزری تو سوار کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ وہ گھوڑے پر سے الٹ گیا تھا۔

شاہینہ اس کے ایک کان کا حصہ کاٹ کر اپنی چونچ میں لے گئی تھی۔

اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ گھوڑے سے اس طرح الٹ گیا تھا کہ ایک پاؤں رکاب میں پھنسا رہ گیا تھا۔ گھوڑا بھاگتا جا رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ چشمے کے قریب گھوڑے کو روک لیا گیا۔ پھر اس کے پاؤں کو رکاب سے نکالا گیا۔ بنّے نے کہا۔ "اطمینان رکھو۔ وہ پرندہ تم پر حملہ نہیں کرے گا کیونکہ اب تمہارے پاس رائفل نہیں ہے۔"

☆------☆------☆

ایک ہفتے بعد ایک طرف سے پانچ آدمی بھاگتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی، دوسرے کے پاس ریوالور تھا اور باقی تین آدمیوں کے پاس لانبے لانبے چھرے تھے۔ وہ چشمہ کا علاقہ ایسا تھا کہ ادھر سے کوئی بھی شریف آدمی نہیں گزرتا تھا۔ اگر کوئی شریف آدمی ہوتا بھی تو وہ حالات سے مجبور ہو کر قاتل بن کر ادھر آتا تھا لہٰذا ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوتا تھا۔

شاہینہ نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔ آنے والے اس پر گولی چلاتے رہے۔ وہ کبھی کسی ٹیلے کے پیچھے، کبھی کسی چٹان کے پیچھے چھپ جاتی تھی یا فضا میں دائیں بائیں اپنی سمت بدل کر ان کی گولیوں سے بچنے لگتی تھی۔ چشمے کے پاس رہنے والوں نے انہیں چیخ چیخ کر سمجھایا کہ وہ اس پرندے پر فائر نہ کریں اور اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ پھر انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

جو لوگ ہتھیار پھینکنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ وہ خود بھی نہتے تھے اس لئے آنے والوں کو اعتراض نہیں ہوا۔ انہوں نے فوراً ہی ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے اپنے ہتھیار دور پھینک دیئے اس کے ساتھ ہی شاہینہ ایک چٹان پر سکون سے بیٹھ گئی۔ بنّے نے آگے بڑھ کر کہا۔ "دیکھ لیا، ہم نہ کہتے تھے کہ یہ پرندہ اب آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آئیے، ہم سب دوست ہیں۔"

وہ لوگ ایک ٹیلے کے پاس ایک دوسرے سے مصافحہ کرنے لگے۔ اپنا اپنا تعارف کرانے لگے۔ ان میں سے کوئی آزاد علاقے سے بھاگا ہوا قاتل تھا کوئی قانون کی گرفت سے نکلا ہوا مفرور تھا۔ وہ پانچوں، جو ابھی آئے تھے، وہ اسمگلر تھے۔ ان میں

سے ایک نے بتایا کہ ایک جگہ زبردست پولیس مقابلہ ہوا تھا۔ اس میں قانون کے کئی محافظ مارے گئے تھے۔ اگر وہ لوگ پکڑے جائیں گے تو انہیں سزائے موت ہوگی۔ اس لئے وہ لوگ بھاگ کر ادھر چلے آئے ہیں۔

آنے والوں کے پاس بہت سی دولت تھی۔ ڈھیر ساری نقد رقم کے علاوہ سونے کے سکے تھیلے میں بھرے ہوئے تھے۔ بنٹے نے انہیں دیکھ کر کہا۔ "اس ویرانے میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہاں صرف کھانے پینے کی چیزوں کی اہمیت ہے۔ پینے کے لئے یہ ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ہے اور راشن میرے پاس ہے' جسے میں بہت کم قیمت پر فروخت کرتا ہوں۔"

رات کو کھانے کے وقت سب ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں ہم اپنے اپنے ہتھیار اٹھا نہیں سکتے۔ اگر کوئی دشمن آگیا یا قانون کے محافظ آگئے تو ہم اپنی حفاظت کیسے کریں گے؟"

اس مفرور نے کہا۔ "کاکے کی جھونپڑی کے سامنے میری ایک رائفل کئی دنوں سے پڑی ہوئی ہے۔ میں اسے ابھی تک اٹھا نہیں سکا۔ اس لئے کہ وہ مادہ فوراً ہی غصے میں آجاتی ہے۔"

آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ "ہم آدھی رات کے بعد اندھیرے میں جاکر اپنے ہتھیاروں کو اٹھالیں گے۔ پھر یہاں انہیں چھپاکر رکھ لیں گے۔"

اس نے کہا۔ "میں ایسا بھی کرکے دیکھ چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ اگر تم لوگ کامیاب ہو جاؤ گے اور دن کی روشنی میں اس مادہ کو جب وہ ہتھیار نظر نہیں آئیں گے تو وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

ایک نے کہا۔ "یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ ہم سب ایسے مجرم ہیں کہ بغیر ہتھیار کے رہ نہیں سکتے۔"

بنٹے نے کہا۔ "یہاں سے جتنے بھی لوگ گزر کر مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف جاتے ہیں وہ سب مجرم ہوتے ہیں۔ کوئی قاتل کوئی مفرور اور کوئی اسمگلر ہوتا ہے لیکن یہاں اب کوئی ہتھیار لے کر نہیں آسکے گا۔ پولیس والے بھی یہاں رائفلوں اور دوسرے ہتھیاروں کے ساتھ آئیں گے تو وہ مادہ انہیں اس علاقے میں آنے نہیں

دے گی یہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہے۔ جب سے اس کے بچے کو مارا گیا ہے تب سے یہ شور مچانے والے ہتھیاروں کی دشمن بن گئی ہے۔ اپنے پاس چاقو جیسے خاموش ہتھیار رکھو' یہ کچھ نہیں کہتی۔ ہم ایسے ہتھیار اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اس کے اندر یہ بات سما گئی ہے کہ جو ہتھیار شور مچاتے ہیں وہ معصوم بچوں کے قاتل ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی بھی رائفل یا ریوالور والے کو برداشت نہیں کرتی ہے۔"

وہ لوگ کچھ دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ پھر ایک نے سر کو ہلا کر کہا۔ "اس طرح سے یہ بات ہمارے لئے فائدہ مند ہے۔ یہاں کوئی بھی ہتھیار لے کر نہیں آسکے گا لیکن جب تک ہمارے سر سے خطرہ نہ ٹلے اور ہمیں یہ اطلاع نہ ملے کہ ہم قانون کی زد سے محفوظ ہیں اس وقت تک ہم کسی آبادی میں واپس نہیں جاسکیں گے۔ ہمیں یہاں پناہ لینے کے لئے اپنی حفاظت کا سب سے پہلے خیال رکھنا ہوگا اور حفاظت بندوقوں سے ہوتی ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "اور بندوق ہم رکھ نہیں سکتے۔"

"اگر ہم نہیں رکھ سکتے تو کوئی دوسرا بھی نہیں رکھ سکتا۔ نہ کوئی ہمارا دشمن رکھ سکتا ہے نہ قانون کے محافظ اپنے پاس ہتھیار رکھ سکتے ہیں۔ اس طرف کوئی بھی آئے گا تو اسے نہتا آنا ہوگا اور نہتوں سے ہم خالی ہاتھ نمٹ سکتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس چاقو بھی تو ہیں۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "گویا کہ یہ ایک ایسا علاقہ بن رہا ہے جہاں جان لیوا ہتھیاروں پر پابندی ہوگی۔ یہ ایک پرُامن' غیر جانبدار علاقہ ہوگا۔ نہ قانون کے محافظ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے' نہ ہی آزاد علاقے سے آنے والے قاتل ہمیں نقصان پہنچا سکیں گے۔"

"مادہ پرندے کی یہ ضد ہمارے حق میں بہت اچھی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پرندے کی حمایت میں یہی کوشش جاری رکھیں۔ اب یہاں کوئی بھی ہتھیار بردار نہ آئے۔ یہاں آنے والوں پر دور ہی سے پابندی لگادی جائے گی۔"

"ایک طرح سے سوچا جائے تو وہ ممتا کی ماری ہم لوگوں کو انسانوں کی طرح جینے کا سلیقہ سکھا رہی ہے۔ اگر ہم لوگوں کے پاس ہتھیار نہ ہوں تو ہم پرُامن زندگی گزار

سکتے ہیں۔ ہم چاہے کیسے ہی قاتل ' بدمعاش ' اور اسمگلر کیوں نہ ہوں۔ جب ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے تو ہم بڑی لڑائیاں نہیں لڑیں گے۔ ہلکی پھلکی سی جھڑپ ہو گی بیچ بچاؤ ہو گا' سمجھوتہ ہو گا' پھر دوستی ہو جائے گی۔ ہتھیار کے ہونے سے ایک طرف سے گولی چلتی ہے اِدھر والا مارا جاتا ہے۔ اِدھر سے گولی چلتی ہے تو اُدھر والا مارا جاتا' یہاں ایسا نہیں ہو گا۔"

بنئے نے کہا۔ "ہمیں یہاں ایک سوسائٹی بنانا چاہئے۔ ہم سب اس علاقے کا انتظام کریں گے۔ آئندہ آنے والوں اور قیام کرنے والوں کو یہاں کے قانون اور قواعد کا پابند بنائیں گے اور ہم اس جگہ کا ایک نام بھی رکھیں گے۔"

کسی نے پوچھا۔ "نام کیا ہو گا؟"

بنئے نے کہا۔ "یہ جگہ اس مادہ پرندے کی وجہ سے محفوظ ہوتی جا رہی ہے اور یہ صرف اپنے بچوں کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔ جس مفرور کے بچے کو گولی لگی تھی۔ اس بچے کو اس کا باپ شاہ خان کہتا تھا اور اس پرندے کے بچے کو اس نام میں شریک کر لیا جائے تو ہم اس جگہ کا نام بچہ شاہ رکھ سکتے ہیں۔ یہ بچہ شاہ کی بستی کہلائے گی۔"

اس کی بات پر سب متفق ہو گئے۔ اسی دن سے اس جگہ کا نام بچہ شاہ کی بستی رکھ دیا گیا۔ اب وہاں جو بھی مفرور آتا تھا۔ وہ میلوں دور سے اپنے ہتھیار اتار دیتا تھا۔ انہیں سمجھا دیا جاتا تھا کہ ہتھیاروں پر پابندی ہے۔ اس علاقے میں نہتے جانا ہو گا۔ جو لوگ نہیں مانتے تھے اور جبراً آتے تھے۔ انہیں شاہینہ کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ اپنے ناک' کان یا آنکھوں سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ تب کہیں ان کی سمجھ میں یہ بات آتی تھی کہ بچہ شاہ کی بستی ایک پُرامن جگہ ہے۔ جہاں قاتل اور بدمعاش بھی امن و امان سے رہتے ہیں۔

امن و امان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں سب لوگ شریف بن گئے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ وہاں کبھی کبھی چاقو چھری چل جاتے تھے۔ لاٹھیاں بھی چلتی تھیں۔ کچھ لوگ زخمی ہوتے تھے۔ پھر معاملہ رفع دفع ہو جاتا تھا۔ جہاں اتنے سارے مفرور' مجرم' قاتل' غنڈے' بدمعاش اور اسمگلر ہوں۔ وہاں تین چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ قمار خانے' شراب خانے اور شباب خانے۔ ان کے بغیر بدمعاشیاں مکمل نہیں ہوتیں۔

وہاں شراب کی بھٹیاں کھلنے لگیں۔ دور دراز کی آبادیوں سے طوائفیں آنے لگیں۔ پھر اسمگلنگ کا مال وہاں فروخت ہونے لگا۔ اب بڑے بڑے شہروں کے لوگ اپنی کاروں میں وہاں آتے تھے جو مال انہیں ملک کے شہروں میں نہیں ملتا تھا' وہاں اچھے سستے داموں مل جاتا تھا۔ اس طرح بچہ شاہ کی بستی جیسے پلک جھپکتے ہی آباد ہو گئی تھی۔ وہاں قانون کے محافظ نہیں آتے تھے لیکن وہ وہاں سے تقریباً دس میل دور اپنی سرحدی چوکی میں ضرور موجود رہتے تھے۔ کار میں بیٹھ کر آنے والے دولت مندوں سے رشوت لیتے تھے۔ پھر انہیں بچہ شاہ کی بستی میں جانے کی اجازت دے دیتے تھے۔ ویسے وہ بھی کار والوں کو سمجھاتے رہتے تھے کہ کوئی شور مچانے والا ہتھیار اپنی گاڑی میں رکھ کر نہ لے جائیں۔ اگر ریوالور وغیرہ ہوں تو چوکی میں جمع کرا دیں۔ واپسی میں اپنی چیزیں لے کر چلے جائیں کیونکہ وہ آسمانی بلا کسی کو معاف نہیں کرتی ہے۔

کبھی کبھی وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ ایک وقت تھا جب شاہینہ نے پہلی بار اپنے بچے کو انڈے میں سے نکلتے دیکھا تھا۔ اسی وقت اس نے ایک چٹان کے سائے میں ایک نوزائیدہ انسانی بچے کی آواز سنی تھی۔ ٹھیک اسی طرح ایک دن وہ پرواز کرتی ہوئی بستی سے بہت دور ایک پہاڑی پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ہی اسے ایک چٹان کے سائے میں نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

وہ وہاں سے پرواز کرتی ہوئی اس چٹان پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا۔ چٹان کے سائے میں بالکل ویسا ہی منظر تھا۔ ایک عورت اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ پتھریلی زمین پر لیٹی ہوئی تھی اور کراہ رہی تھی۔ اس کا مرد چٹان کے سائے میں کھڑا ہوا یوں چوکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے اب تب میں کہیں سے دشمن کے آنے کا اندیشہ ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا چاقو تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں رائفل ہوتی تو شاید شاہینہ اسے بھی نہ چھوڑتی۔ وہ ایسے کسی ہتھیار کو برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی جو بچوں کی زندگی چھین لیتے ہیں۔

چاقو سے بھی زندگیاں چھینی جاتی ہیں لیکن یہ بات شاید وہ نہیں جانتی تھی یا اس کے تجربے میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ اس لئے چاقو رکھنے والے اس کے غصے سے محفوظ رہتے تھے۔ چٹان کے سائے میں مرد اپنی عورت سے کہہ رہا تھا۔ "لبنی تم نے

بڑے حوصلے سے کام لیا ہے اور اب تم نے مجھے اپنے بیٹے کا باپ بنا دیا ہے۔ میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ بس تمہاری مصیبت کے دن کٹنے والے ہیں بچہ شاہ کی بستی یہاں سے قریب ہے۔ سنا ہے کہ وہاں کسی کو آتشیں اسلحہ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ہمارے دشمن آبھی جائیں تو وہ ایسے اسلحہ کو لے کر نہیں آسکیں گے۔ ہمیں ان کی طرف سے زیادہ خطرہ نہیں رہے گا۔"

لبنیٰ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "کامران! آپ میری بات مان لیں۔ بستی اگر یہاں سے قریب ہے تو چلے جائیں۔ وہ لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہیں۔ وہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں یہاں تنہا رہ جاؤں گی تو وہ مجھ پر اور میرے بچے پر رحم کھا سکتے ہیں لیکن آپ پر انہیں ذرا بھی رحم نہیں آئے گا۔ خدا کے لئے آپ یہاں سے چلے جائیں میں آپ کے پیچھے چلی آؤں گی۔ بس ذرا طبیعت سنبھل جائے۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ میں اتنا بزدل اور بے غیرت نہیں ہوں کہ تمہیں مصیبت میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ جاؤں۔ وہ بھی ایسے وقت جب کہ میرے بیٹے نے جنم لیا ہے۔ میری ذمہ داریاں اب اور بھی بڑھ گئی ہیں۔"

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "آہ' ذمہ داریاں تو بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ جب آپ نے مجھ سے شادی کی تب ہی آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ ہم دو سے تین اور چار اور دس بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے خاندان کو بڑھائیں گے تو اپنے دشمنوں کو نہیں بڑھانا چاہئے۔ دشمنوں کی تعداد کم سے کم ہو۔ دانشمندی یہ ہے کہ دشمن بالکل ہی نہ ہوں لیکن ہم پتہ نہیں کیوں ایسی دشمنی کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کی زندگی چھین لینے کے درپے رہتے ہیں' اور جب ایسا وقت آتا ہے تو اپنی بیوی اور بچوں کی جانیں بچانے کے لئے اپنا گھربار' اپنا وطن چھوڑ کر جنگلوں' بیابانوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اب ہم جیسے لوگ بچہ شاہ بستی میں جا کر پناہ لینے لگے ہیں۔ ایسا کب تک ہوگا؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہم اپنی آن اور غیرت کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے۔ دشمنوں کو بے باکی سے للکارتے ہیں۔ چاہے وہ ہماری جان لے لیں یا ہم ان کی زندگی سے کھیل جائیں لیکن اب جبکہ مجھے تمہاری محبت ملی ہے اور اولاد کا سکھ چین ملنے والا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ ہم دشمنی کیوں کرتے

ہیں؟ اور یہ دشمنی کب تک نسل در نسل چلتی رہے گی؟ کیا تمہاری اولاد کو انتقام کے جنونی جذبوں سے تحفظ نہیں ملے گا؟"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر آگے بڑھتے ہوئے چٹان کے اوپر دیکھا' پھر حیرانی سے بولا۔ "یہ تو وہی مادہ پرندہ معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر شہر شہر' گاؤں گاؤں تک پہنچا ہوا ہے۔ ہمارے سر پر جو چٹان ہے یہ اس پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

لبنیٰ نے خوش ہو کر کہا۔ "ابھی آپ نے پوچھا تھا کہ ہماری اولاد کو نسل در نسل دشمنی سے کیسے تحفظ ملے گا تو جواب مل گیا۔ اس کی موجودگی سے ہمیں تحفظ کا یقین ہوتا ہے۔ یہ وہی ممتا کی ماری ہے جس نے اپنے اور ایک انسانی بچے کی خاطر اس بستی میں آتشیں اسلحات کی پابندی لگا دی ہے کسی کو خون خرابے کی اجازت نہیں دیتی۔ یقیناً ہم خدا کے بعد زمین پر اس کی ممتا کے سائے میں اپنے بچے کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ آپ ہمیں یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ یہ ہمارے سروں پر آ کر بیٹھنے والی ہماری حفاظت کرے گی۔ کسی دشمن کو ہمارے قریب نہیں آنے دے گی۔"

کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جب یہ تمہاری حفاظت کر سکتی ہے تو پھر میری بھی حفاظت کرے گی۔ میں دشمنوں کے ڈر سے بستی کی طرف کیوں جاؤں؟"

"میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ ہو سکتا ہے کہ دشمن چالاک ہوں۔ وہ اِدھر آنے سے پہلے اپنے ریوالور اور رائفلیں وغیرہ کہیں چھپا دیں اور اس مادہ پرندے کی خوشنودی حاصل کر لیں۔ پھر یہ آنے والے دشمنوں کو بھی کچھ نہیں کہے گی۔ سنا ہے کہ یہ صرف آتشیں اسلحات کی دشمن ہے۔"

"بے شک یہ ایسے ہتھیاروں کی دشمن ہے لیکن یہ ایسے لوگوں کی بھی دشمن ہو سکتی ہے جو بچوں کے دشمن ہوں کیونکہ یہ اپنے بچوں کا صدمہ اٹھا رہی ہے یقیناً بچوں سے بہت محبت کرتی ہوگی۔ اگر ہم اس ممتا کی ماری کو اپنی داستان سنائیں تو اسے ہمارے بچے سے بھی پیار ہو جائے گا۔"

کامران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم کیسی مضحکہ خیز باتیں کر رہی ہو۔ بھلا ایک پرندے کو ہم اپنی داستان کیا سنائیں گے اور وہ کیا سنے گا یا سنے گی؟"

"میں نہیں جانتی کہ پرندوں کے کان ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہوتے ہیں تو وہ کیسی آوازیں سنتے ہیں؟ کن آوازوں کو پہچانتے ہیں اور کن باتوں کو سمجھ نہیں پاتے مگر میں آج ماں بن کر یہ سمجھ رہی ہوں کہ یہ جو اپنے بچے کا صدمہ اٹھانے والی ماں ہے۔ یہ ضرور میرے درد کو سمجھتی ہوگی میرے جذبوں کو' میرے اندیشوں کو یقیناً سمجھ لے گی کہ میں اپنے بچوں کی سلامتی کس طرح چاہتی ہوں۔ کیا ہرج ہے اسے اگر اپنی آپ بیتی سنا دی جائے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "سنا ہے پچھلے زمانے میں ایسے کچھ لوگ گزرے ہیں جو جانوروں کی بولیاں سمجھ لیتے تھے لیکن یہ کبھی نہیں سنا کہ ایسے جانور گزرے ہوں جو انسانوں کی بولیاں سمجھ لیتے ہوں وہ تو صرف اشاروں کی زبان سمجھتے ہیں اور اشاروں سے سدھائے بھی جاتے ہیں۔"

وہ اپنے بچے کی طرف کروٹ لے کر بولی۔ "جانے دیجئے۔ میں اپنے بچے کو سناؤں گی۔ ہو سکتا ہے وہ ممتا والی بھی سن لے اور سمجھ لے۔"

وہ اپنے بچے کو ہولے ہولے پیار سے سہلاتے ہوئے بولی۔ "میرے بچے! میں تیری ماں ہوں اب سے چند گھڑیوں پہلے نہ تو بیٹا تھا نہ میں ماں تھی۔ مگر ہاں جب میں نے عورت بن کر جنم لیا تب ہی سے میرے اندر بہت دور کہیں تیرا نام لکھ دیا گیا تھا کہ ایک گھڑی آئے گی جب میں دلہن بنوں گی۔ پھر ایک گھڑی آئے گی جب میں تیری ماں بنوں گی اور وہ گھڑی آ گئی ہے لیکن میرے بچے! ان مبارک لمحات کو پانے سے پہلے زندگی کے بہت سے مکروہ چہرے دیکھنے پڑتے ہیں۔

"جب میں دلہن بنی۔ میں نے ماتھے پر جھومر سجایا۔ سہاگ کا آنچل سر پر ڈالا' دلہن کا لباس پہنا تو میں نہیں جانتی تھی کہ تیرے باپ کے خاندان میں ایک طویل عرصے سے انتقامی جنون چلا آ رہا ہے۔ تیرے باپ کے خاندان کے لوگ اپنے دشمنوں کو مارتے ہیں اور وہ دشمن تیرے باپ کے خاندان والوں کو مارتے ہیں۔

"یہ کیسی دنیا ہے اور ہم کیسے ہیں کہ ایک گھر کی چار دیواری بنا کر اس میں اپنی عورت اور بچے کے لئے چھت ڈال کر باہر خون کی ہولی کھیلتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ دشمن اس گھر کی چار دیواری کو بھی آگ لگائیں گے نہ بیوی رہے گی نہ بچہ رہے گا۔

ہمارے پاس سب کچھ ہے لیکن امن و آشتی سے رہنے والی عقل نہیں ہے۔"

کامران شرمسار سا ہو کر بولا۔ "لبنیٰ تم مجھے طعنے دے رہی ہو؟"

"میں آپ کی شریکِ حیات ہوں' آپ کی کنیز ہوں' آپ کو کبھی طعنے نہیں دے سکتی لیکن میں ایک ماں ہوں' اس لئے آپ جیسے لوگوں کا محاسبہ کر سکتی ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہارے محاسبے کا حساب یہی ہے کہ جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تب ڈوبنے کا پتہ چلتا ہے۔ پتہ نہیں ہمارے آباؤ اجداد کس زمانے سے انتقامی کارروائیاں کرتے چلے آتے ہیں؟ ہمارے خاندان میں کس بات پر جھگڑا شروع ہوا تھا؟ جس بات پر جھگڑا شروع ہوا تھا وہ بات کہیں گم ہو گئی صرف جھگڑا رہ گیا۔ اس جھگڑے میں ہم نے ایک دوسرے کی ماؤں کی کوکھ اجاڑی۔ اپنی بیویوں کے سر سے سہاگ کا آنچل کھینچ لیا اور ننھے منے معصوم بچوں کے کومل کومل سینوں میں بندوق کی گولی اتار دی۔"

لبنیٰ نے دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کو آواز دی۔ "یاالٰہی! یہ بچہ شاہ کی بستی ہمیشہ ہمیشہ آباد رہے۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں آ کر سارے خون خرابے کرنے والے اپنے اپنے ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "خدایا! ہم جیسے انتقامی جنون کے مارے بچہ شاہ کی بستی میں آتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے رہتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کی سلامتی کے لئے دشمنوں کی طرف سے سہمے رہتے ہیں اور صرف تجھ سے دعا مانگتے ہیں کیونکہ ہتھیار پھینک دینے کے بعد صرف دعاؤں کی قبولیت کا آسرا باقی رہ جاتا ہے۔"

لبنیٰ نے کہا۔ "خدایا! میں تیرے بعد اس ممتا کی ماری مادہ پرندے سے کہتی ہوں کہ دیکھ میں بھی ایک ماں ہوں اور اپنے ننھے سے بچے کو لے کر تیری بستی میں قدم رکھنے والی ہوں' تو میرے بچے کی حفاظت کرنا۔ اگر نہ کر سکی تو میں قیامت کے دن تیرے پروں کو نوچ لوں گی اور فریاد کروں گی کہ تو ایک ناکام ماں ہے اپنے بچے کی حفاظت نہ کر سکی' پرائے بچے کو بھی دشمنوں سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ اے ممتا کی ماری! سوچ لے' میں آ رہی ہوں۔"

☆------☆------☆

وہ چاروں بچہ شاہ کی بستی کی طرف دوڑے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ذرا سلیقے کا لباس پہنا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تعلیم یافتہ اور دولت مند ہے۔ اس کی آنکھوں پر ایک عینک تھی۔ اس کے باقی تین ساتھی اپنے لباس سے ہی غنڈے بدمعاش لگتے تھے۔ ان چاروں کے شانوں پر بڑے بڑے بیگ تھے۔ شاید ان میں ان کی ضروریات کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک کے پاس چاقو تھا۔ باقی تین نہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ادھر ہتھیاروں کے ساتھ گزر نہیں ہے۔

بچہ شاہ کی بستی سے تقریباً پانچ میل دور وہ لوگ ایک چٹان کے پاس ٹھٹک گئے۔ چٹان کے سائے میں پتھریلی زمین پر بہت سا خون پھیلا ہوا نظر آیا۔ عینک والے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ہوں........ وہ لوگ اسی راستے سے گزرے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عورت نے یہاں بچے کو جنم دیا ہے۔"

ایک نے دانت پیسنے کے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ "ہی ہی ہی حرامزادی ماں بن گئی ہے۔"

عینک والے نے انگلی اٹھا کر اس انگلی کو نہیں کے انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، نہیں، کسی حرامزادی کو ماں مت کہو اور کسی ماں کو حرام زادی کبھی نہ کہا کرو ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ خواہ وہ دشمن کی بیوی کیوں نہ ہو۔ ہمارا جھگڑا صرف کامران سے ہے اور کامران کے بعد اس کے بچے سے۔"

ایک نوجوان نے اپنے چاقو سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! دشمن کے لئے نرم الفاظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ اسے جتنا گالیوں سے یاد کیا جائے' اتنی ہی نفرت شدید ہوتی ہے انتقام کا جذبہ اور زور پکڑتا ہے یہ لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے لیکن آپ کی تعلیم نے آپ کے دماغ سے یہ سب کچھ بھلا دیا ہے۔ آپ کو پتھر سے موم بنا دیا ہے۔ آپ دشمنوں کے لئے بھی نرم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔"

عینک والے نے اپنے نوجوان بھائی سے کہا۔ "شیر خان! میرا نام دلیر خان ہے' تعلیم نے مجھے موم بنایا ہے' بزدل نہیں بنایا ہے ہم جنہیں مٹانے جارہے ہیں۔ انہیں گالی دینا کوئی ضروری نہیں ہے۔ خاندانی روایات کے مطابق میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انتقام لینے پر مجبور ہوں۔ سوچتا ہوں کہ اب ہمارے دشمنوں کے خاندان میں

صرف کامران رہ گیا ہے اور آج اگر اس کی بیوی نے اس کے بیٹے کو جنم دیا ہے تو پھر اس کے بیٹے کو بھی ٹھکانے لگانا ہوگا۔ بس یہی دو کانٹے رہ گئے ہیں اس کے بعد دشمنوں کا خاندان بالکل نیست و نابود ہو جائے گا۔ میں اس قصے کو بچہ شاہ کی بستی میں پہنچ کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ آؤ آگے بڑھیں یہاں ٹھہر کر وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔"

وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ دلیر خان نے اپنی عینک کو آنکھوں پر درست کرتے ہوئے اپنے بیگ میں سے ایک بڑا سا سگار کا ڈبہ نکالا پھر اس کا ڈھکن کھولا۔ اس میں سے پانچ عدد بڑے سائز کے سگار رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے چار تو بالکل صحیح طور پر سگار ہی تھے لیکن پانچواں سگار کی صورت میں آتشیں اسلحہ تھا۔ ریوالور کی طرح استعمال ہوتا تھا۔ اس کی نلکی میں صرف ایک کارتوس لگتا تھا۔ ایک سے زیادہ کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی تھی اور دلیر خان جانتا تھا کہ اسے کیسے استعمال کرنا چاہئے اور اس سے نکلے ہوئے ننھے سے کارتوس کو کس طرح دشمنوں کے سینے میں اتارنا چاہئے۔ اس نے ایک سگار کو نکال کر دانتوں سے اس کے سرے کو کاٹ کر ایک طرف تھوک دیا۔ پھر چلتے چلتے ایک جگہ رک کر اسے سلگایا پھر اس کا کش لینے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

بچہ شاہ کی بستی میں دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ خیموں کے سائے میں دکانیں لگائی جاتی تھیں۔ اسمگلنگ کا مال ہو یا گوشت سبزیاں سب کچھ خیموں کے سائے میں فروخت ہوتا تھا۔ لوگ دور دور کے شہروں سے اسمگلنگ کا مال خریدنے آتے تھے۔ صبح سے شام تک وہاں میلہ سا لگا رہتا تھا۔ جو لوگ وہاں مستقل قیام کرتے تھے انہوں نے مٹی کے کچے مکانات بنائے تھے۔ بہت سے مکانات لکڑیوں کے شہتیروں سے بنے ہوئے تھے اور ایسے مضبوط لکڑیوں کے مکانات دو منزلہ بھی تھے۔ وہاں آکر عارضی رہائش اختیار کرنے والوں کو ان مکانات کے ایک آدھ کمرے کرائے پر بھی مل جاتے تھے۔

دلیر خان اور شیر خان نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایسا ہی ایک مکان کرائے پر حاصل کر لیا۔ لکڑی کے شہتیروں سے بنے ہوئے مکان کا نچلا حصہ دو کمروں پر مشتمل

تھا۔ اوپر ایک کمرہ تھا۔ دلیر خان نے کہا۔ "شیر خان! تم ان دو آدمیوں کے ساتھ یہاں نیچے رہو گے تمہارے لئے یہ کمرہ مخصوص ہے۔ یہ دونوں اس بازو والے کمرے میں رہیں گے اور میں اوپر رہوں گا۔ آؤ ہم اوپر چلتے ہیں۔"

وہ انہیں لے کر اوپر کے کمرے میں آیا۔ وہاں سے چاروں طرف بازار نظر آتا تھا۔ خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں کا شور سنائی دیتا تھا اور آنے والے نئے چہرے بھی نگاہوں کے سامنے رہتے تھے۔ دلیر خان نے کہا۔ "یہاں سے میں نظر رکھوں گا کامران شاہ ضرور ادھر سے گزرے گا تو مجھے نظر آجائے گا۔"

شیر خان نے پوچھا۔ "بھائی جان! کیا آپ یہاں بیٹھ کر اپنے دشمن کا انتظار کریں گے؟ یہ بستی بہت زیادہ بڑی نہیں ہے ہم چند منٹ میں کامران شاہ کو ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"بے شک ہم ایسا کرسکتے ہیں لیکن اسے تلاش کرکے یہاں کے لوگوں پر یہ تاثر نہ چھوڑو کہ ہم کسی کو قتل کرنے آئے ہیں۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے بھی رہتے ہیں' محتاط بھی رہتے ہیں اور حملہ کرنے والوں کو روک بھی سکتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس بستی میں خون خرابہ ہو۔ ہم کامران شاہ کو تلاش کریں گے تو بہت سے لوگ اس کی حمایت میں ڈھال بن جائیں گے۔"

"بھائی جان! آپ کے منصوبے میں کھوٹ معلوم ہوتا ہے یوں لگتا ہے جیسے آپ دشمن کو جان بوجھ کر ڈھیل دے رہے ہیں۔ اس طرح تو وہ یہاں سے بھی فرار ہو جائے گا۔"

دلیر خان نے عینک اتار کر اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "شیر خان! بے شک ہم ایک ماں کے بیٹے نہیں ہیں۔ ہماری دو مائیں ہیں لیکن ہمارا تمہارا باپ ایک ہے۔ میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ کامران شاہ نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔ جو درد تمہارے دل میں ہے وہی میرے دل میں بھی ہے۔ میں دشمن کو ڈھیل نہیں دے رہا ہوں مصلحت سے کام لے رہا ہوں۔ تمہیں بھی سمجھا رہا ہوں کہ کامران شاہ اگر کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آئے تو اسے بالکل نظر انداز کردو۔ اجنبی کی طرح اس کے پاس سے گزر جاؤ' اسے چھیڑنے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے

ہمارے یہ دو کرائے کے آدمی کافی ہیں۔"

اس نے ان دونوں غنڈوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "گبرو! اور جھبرو! میں تم دونوں کو پہلے سمجھا چکا ہوں کہ کامران شاہ کو ہم اپنے ہاتھوں سے قتل کریں گے۔ تم دونوں صرف نہتے اس سے مقابلہ کرو گے' اسے اتنے زخم دو گے اور اس قدر دہشت زدہ کرو گے کہ وہ زخموں سے مجبور ہو کر یہاں سے بھی بھاگ نکلے۔ جب وہ اس بستی سے دور ایسی جگہ پہنچے گا جہاں ہم اسے گولی کا نشانہ بناسکیں یا شیر خان اسے اپنے چاقو سے ہلاک کرسکے تو پھر تم دونوں کا کام ختم ہو جائے گا۔"

"بھائی جان! میرا مشورہ ہے کہ یہاں اور دو چار آدمیوں کو کرائے پر حاصل کرلیا جائے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامران شاہ شہ زور بھی ہے اور شاطر بھی ہے۔ دو آدمیوں کے بس کا نہیں ہے۔"

"ہوں۔ تمہارا مشورہ معقول ہے۔ ہم تھوڑی دیر یہاں تھکن اتارلیں' پھر باہر نکل کر اپنے کام کے آدمیوں کو تلاش کریں گے۔ تم لوگ نیچے جاؤ' میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔"

شیر خان اپنے دو کرائے کے غنڈوں کے ساتھ اوپری کمرے سے اتر کر نیچے آگیا۔ گبرو نے شیر خان سے کہا۔ "صاحب! وہ بڑے خان صاحب تو کچھ ڈھیلے نظر آتے ہیں۔"

شیر خان نے سفاکی سے مسکرا کر کہا۔ "میں تو ڈھیلا نہیں ہوں؟"

یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر سے چاقو نکالا' پھر کہا۔ "دیکھو! وہ سامنے دروازے پر ایک چھوٹا سا دائرہ نظر آرہا ہے۔ یہ چاقو ٹھیک اس دائرے کے وسط میں پیوست ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے چاقو کی نوک پکڑ کر نشانہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چاقو فضا میں تیر کی طرح گیا پھر اس لکڑی کے ننھے سے دائرے میں بیچوں بیچ کھٹ کی آواز کے ساتھ پیوست ہوگیا۔ وہ دونوں کرائے کے بدمعاش تعریفی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر چاقو کو وہاں سے نکال کر بولا۔ "اب بتاؤ! میں تو ڈھیلا نہیں ہوں؟ ویسے تم لوگوں نے میرا ساتھ نہیں دیا تو دشمن ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

گبرو نے کہا۔ "صاحب! ہمیں تو آپ ہی لے کر آئے تھے اور آپ ہی نے بڑے خان صاحب سے ملاقات کرائی تھی۔ معاوضہ بڑے خان صاحب نے طے کیا لیکن دوستی تو آپ سے رہی ہے۔"

شیر خان نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں میرے وفادار رہو۔ کبھی ایسا موقع آئے کہ بھائی جان نے ڈھیل دی اور دشمن فرار ہونا چاہے تو اس وقت تم لوگ میرے حکم کی تعمیل کرو گے۔"

جھبرو نے کہا۔ "جناب! آپ جس وقت کہیں گے اسی وقت آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ بس ذرا معاوضے کا خیال رکھیں۔ بڑے خان صاحب نے جو کچھ دیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ کچھ آپ کو بھی تو......"

شیر خان نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "ہاں' ہاں' ضرور' آج رات کو میں تمہیں دو ہزار دوں گا۔ تم لوگ آپس میں بانٹ لینا۔ کام ختم ہونے کے بعد اور دو ہزار تمہیں ملیں گے۔ بولو ٹھیک ہے۔"

وہ راضی ہو گئے۔ شام ہوتے ہی بازار بند ہو جاتے تھے۔ وہاں کی بھیڑ بالکل ختم ہو جاتی تھی۔ جو میلہ وہاں لگا رہتا تھا۔ وہاں کی رونق قمار خانوں میں منتقل ہو جاتی تھی۔ قمار خانے' شراب خانے اور چکلے آباد ہو جاتے تھے۔ ایسی ہی جگہوں پر کرائے کے قاتل پائے جاتے ہیں۔ شیر خاں انہی کی تلاش میں قمار خانے میں چلا آیا۔

قمار خانے کی فضا دھوئیں اور شراب کی بو سے اٹی ہوئی تھی لوگ مختلف میزوں پر طرح طرح کی بازیاں لگا رہے تھے اور اونچی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ایک شخص چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ہم اس بستی میں آ کر مرد سے عورت بن گئے ہیں۔ عورتوں کی طرح سہمے سہمے رہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی دشمن آ کر ہمیں جان سے نہ مار ڈالے۔ ہمارے پاس اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ہم یہ سوچ کر رہ جاتے ہیں کہ جب ہم نہتے ہیں تو ہمارا دشمن بھی نہتا ہوگا۔ اگر وہ ہتھیار سے لیس ہو کر آئے گا تو وہ مادہ پرندہ اسے یہاں آنے نہیں دے گی۔"

وہ ہوا میں گھونسہ لہراتے ہوئے بولا۔ "میں پوچھتا ہوں۔ وہ مادہ پرندہ کیا چیز ہے' اگر تھائیں سے ایک گولی چلا دی جائے تو وہ پہاڑی پر سے گر کر مر جائے گی۔ پرواز

کرنا بھول جائے گی۔ کسی ہتھیار والے پر حملہ نہیں کر سکے گی۔ اس کا قصہ تمام ہو جائے گا تو ہمارے پاس ہتھیار ہی ہتھیار ہوں گے۔ پھر ہمیں کسی دشمن کا خوف نہیں رہے گا۔"

دوسری طرف سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا۔ "میں جانتا ہوں تم لوگوں نے اس بے چاری مادہ پرندہ کے خلاف تحریک چلائی ہے تم لوگ یہاں کسی طرح آتشیں اسلحات لانا چاہتے ہو۔ یہاں خون خرابے کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہو۔ تم لوگ کیسے انسان ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک جگہ تو ایسی رہنے دو۔ جہاں انسان ہاتھ میں بندوق لے کر نہیں' گلاب کا پھول لے کر ایک دوسرے سے ملے' دشمنی اسی طرح ختم ہو گی۔ دیکھ لو کہ ہم اس بستی میں آ کر لڑنا جھگڑنا بھول گئے ہیں۔"

تیسری طرف سے کسی نے کہا۔ "کیا اس بستی میں لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے ہیں؟ آئے دن تو دنگے فساد ہوتے رہتے ہیں۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "ہاں! ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے دنیا کے کس حصے میں نہیں ہوتے ہیں؟ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد لوگ پھر آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ جھگڑے کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی کسی کی جان تو نہیں لیتا ہے۔ زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔ ایک بار ملتی ہے اور ایک بار چلی جائے تو دوبارہ نہیں ملتی۔ کیا اتنی سی بات کو سمجھانے کی ضرورت ہے؟"

شیر خان نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا کوئی جانی دشمن نہیں ہے۔ اس لئے بندوق کے بجائے گلاب کے پھول کی باتیں کر رہے ہو۔"

اس شخص نے کہا۔ "دیکھو دوست! ہم نفرت سے جسے دشمن بناتے ہیں' محبت سے اس کو دوست بنا سکتے ہیں اگر کوئی تمہارا جانی دشمن ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں اس کا اور اس کو تمہارا دوست بنا دوں گا۔"

وہ امن پسندی کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی اچانک ایک شخص نے اس کے منہ پر گھونسہ جڑ دیا۔ بے چارہ کرسی سمیت پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔ گھونسہ مارنے والے نے کہا۔ "میں تمہارا دشمن ہوں۔ آؤ مجھے دوست بناؤ' میں دیکھتا ہوں کیسے تم گلاب کا پھول ہاتھوں میں لے کر مجھے دوست بنا سکتے ہو؟"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”بھائی! مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ ہم تو کبھی ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ خواہ مخواہ مجھ پر کیوں ہاتھ اٹھا رہے ہو؟“

گھونسہ مارنے والے نے کہا۔ ”میں دوسری بار پھر تمہاری پٹائی کروں گا۔ تم ہماری تحریک سے متفق ہوگے یا نہیں؟ اس بستی میں ہتھیار آنے چاہئیں ہم یہاں عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر نہیں رہ سکتے۔ ہم مرد ہیں اور ہمارے جسم پر ہتھیار سجتے ہیں۔“

”تم لوگ اس بستی میں رہ کر اپنے جسموں پر ہتھیار نہیں سجا سکو گے۔ یہ مادہ پرندہ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔“

وہ حقارت سے بولا۔ ”اونہہ! ہم سب سے پہلے اسی پرندے کو گولی سے اڑا دیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔“

”افسوس! جس کی وجہ سے یہ امن پسند بستی قائم ہوئی ہے تم اسی کو مار ڈالنا چاہتے ہو؟ جس شاخ پر آشیانہ بنا رکھا ہے اسی کو کاٹ ڈالنا چاہتے ہو۔“

اس کے منہ پر پھر ایک گھونسہ پڑا۔ وہ پھر زمین پر گر پڑا۔ سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔ قمار خانے اور شراب خانے میں آنے جانے والے لوگ ہتھیار چاہتے تھے۔ ہتھیار کے بغیر خود کو خالی خالی سمجھتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی کی جان لینا نہیں چاہتے۔ کسی سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار چاہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو ایسا دعویٰ نہ کرتا ہو۔ صرف اپنی حفاظت کی بات کہہ کر دوسروں پر چڑھ دوڑنے کے لئے ہتھیار کا سہارا لیا جاتا ہے اور اب بچہ شاہ کی بستی میں بھی یہی شوق سر اٹھا رہا تھا۔

شیر خان نے اس گھونسہ مارنے والے کے پاس آکر اس کے شانے پر تھپکتے ہوئے کہا۔ ”شاباش! کیا لڑنا چاہتے ہو؟“

گھونسہ چلانے والا بولا۔ ”میں مارنا بھی جانتا ہوں اور مرنا بھی جانتا ہوں۔“

”بہت خوب! مجھے تمہارے جیسے آدمی کی ضرورت ہے تم یہاں کیا کرتے ہو؟“

”ایک ٹرک ڈرائیور ہوں اور ہتھیار اسمگل کرکے اس بستی میں لاتا ہوں۔ وہ مادہ پرندہ چٹانوں کی بلندی سے نہیں دیکھ سکتی کہ ٹرک وغیرہ میں کون کون سا مال آرہا

ہے اور کس مال کے اندر ہتھیار چھپا کر لائے جارہے ہیں۔ ہتھیاروں کو گھر کے اندر چھپا کر رکھو تو وہ گھر کے اندر گھس کر دیکھ نہیں سکتی۔ ادھر پہاڑوں کی بلندی پر پرواز کرتی رہتی ہے۔ صرف اتنا دیکھتی ہے کہ کوئی اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھا کر نہ لا رہا ہو۔“

شیر خان نے پوچھا۔ ”اچھا! تو یہاں چپکے چپکے ہتھیار پھیل رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ہاں! جو اسمگلر یہ سامان منگواتا ہے وہ بڑا منافع حاصل کر رہا ہے منہ مانگی قیمت پر ہتھیار بیچتا ہے۔ کتنے ہی ضرورت مند ہیں۔ وہ لوگ خریدتے ہیں اور اپنے یہاں چھپا کر رکھتے ہیں۔ آج کل میں ہی یک بیک یہ ہتھیار باہر نکلیں گے اور سب سے پہلے اس مادہ پرندہ کا خاتمہ کیا جائے گا۔“

☆------☆------☆

بچہ رو رہا تھا۔ وہ تو نہ شہد چاٹنا چاہتا تھا نہ دودھ پی رہا تھا۔ لبنیٰ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کس طرح چپ کرائے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اسے تکلیف کیا ہے؟ کامران نے کہا۔ ”یہ ایسے چپ نہیں ہوگا۔ تمہیں بچے پالنے کا تجربہ نہیں ہے میں کسی بوڑھی دائی کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ وہی اس کی تکلیف کو سمجھ سکے گی۔“

لبنیٰ نے کہا۔ ”نہیں! میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ رات کا وقت ہے۔ آپ اکیلے جائیں گے۔ پتہ نہیں دشمن کس طرف سے آنکلیں۔ شاید وہ لوگ اس بستی میں آچکے ہوں۔“

کامران شاہ نے سرہانے سے چاقو نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں بزدل نہیں ہوں۔ تم ماں بچے کے تحفظ کے لئے ادھر بھاگ کر چلا آیا۔ ورنہ اپنے ہی علاقے میں ان لوگوں سے نمٹ لیتا۔“

وہ جانے لگا۔ لبنیٰ نے آواز دی۔ ”میری بات مان لیجئے! خدا کے لئے باہر مت جائیے۔“

وہ دروازے سے پلٹ کر بولا۔ ”تم اس دروازے کو اندر سے بند رکھو۔ بچہ روئے جارہا ہے۔ میں یہاں سکون سے بزدلوں کی طرح چھپ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اپنے

بچے کی تکلیف دور کرنے کے لئے مجھے ہر حال میں جانا ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر آیا۔ اس نے بھی لکڑی کے شہتیروں سے بنے ہوئے دو منزلہ مکان کو کرایہ پر لیا تھا۔ اوپر خود رہتا تھا نیچے دوسری فیملی آباد تھی۔ وہ زینے سے اترتا ہوا مکان کے برآمدے میں آیا۔ وہاں اس نے نیچے والی فیملی کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا کیا یہاں کوئی بوڑھی تجربہ کار عورت مل سکتی ہے جو بچے کی تکلیف سمجھ سکے۔"

ایک آدمی نے بتایا۔ "سامنے ہی نکڑ پر جو لکڑی کا مکان ہے وہاں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔ وہ تمہارے کام آسکے گی۔"

وہ اس کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا۔ مکان قریب ہی تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور اپنا مدعا بیان کیا۔ بڑھیا نے پوچھا۔ "تمہارے پاس گھٹی اور مالش کا سامان ہے؟"

"نہیں ماں جی! ہم باہر سے آئے ہیں' پردیسی ہیں۔ ہمارے کچھ نہیں ہے۔"

بڑھیا اندر گئی اور پھر تمام سامان لے کر باہر آگئی۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا اس گلی سے گزرتا ہوا اپنی رہائش گاہ کے سامنے پہنچا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں دلیر خان کی آواز گونجتی ہوئی آئی۔ "اوئے شاہ خاناں! تو کدھر ہے؟"

کامران شاہ نے فوراً ہی پلٹتے ہوئے' اپنے چاقو کو ایک کھٹاکے سے کھولتے ہوئے دیکھا۔ سامنے پندرہ گز کے فاصلے پر دلیر خان نہتا کھڑا ہوا تھا۔ اسے نہتا دیکھ کر کامران شاہ کو ذرا اطمینان ہوا۔ پھر اس نے کہا۔ "اچھا! تو تم دلیر جاناں ہو؟ میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گئے؟"

دلیر خان نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کے انداز میں کہا۔ "اوئے خبردار! دلیر خان کہو' جاناں مت کہو! جاناں کہنے کی دوستی اور محبت ختم ہو چکی ہے۔"

"دلیر خان! دوستی اور محبت تو ہمارے خاندان کے درمیان کبھی نہیں رہی۔ صرف ہم اور تم دوستی کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے کالج کے زمانے میں ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے علاقے میں پہنچ کر صدیوں کی اس دشمنی کا خاتمہ کریں گے۔ تعلیم کی روشنی میں اپنے اپنے خاندان کے لوگوں کو سمجھائیں گے کہ جتنے خون خرابے ہونے

تھے ہو چکے' جتنی جانیں ضائع ہونی تھیں۔ ہو چکیں اب تعلیم کی روشنی میں ہم محبت کے چراغ روشن کریں گے۔"

دلیر خان نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ "اور تم نے محبت کے ان چراغوں کو اپنے علاقے میں پہنچتے ہی گل کر دیا؟ بتاؤ' تم نے وعدہ خلافی کیوں کی؟ تم نے میرے باپ کو قتل کیوں کیا؟"

کامران شاہ نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور اپنے نوزائیدہ بچے کی قسم کھا کر کہتا ہوں' میں نے تمہارے باپ کو قتل نہیں کیا ہے۔ ہم دونوں اچھے طالب علم تھے۔ ہم نے نفرت کو کالج کے باہر ہی تھوک دیا تھا۔ پھر اپنے علاقے میں پہنچ کر میں نفرت کی راہیں کیسے ہموار کر سکتا تھا؟ کچھ تو سوچو' دلیر خان!"

وہ دونوں للکارنے کے انداز میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ آس پاس کے مکانوں اور دکانوں سے لوگ نکل آئے تھے اور اب بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان راستہ صاف تھا۔ لوگ ان کے اطراف ذرا دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ دلیر خان نے کہا۔ "اگر تم سچے ہوتے تو اپنا علاقہ چھوڑ کر نہ آتے اور ہاتھ میں یہ چاقو لئے نہ گھومتے۔"

"دلیر خان! میری مجبوری کو سمجھو۔ میں اپنی سچائی ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں کس خنزیر کے بچے نے تمہارے باپ کو قتل کیا اور الزام مجھ پر آگیا۔ ویسے کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ جس وقت تمہارے باپ کا قتل ہوا' میں وہاں سے چار میل کے فاصلے پر اپنے گھر کے اندر تھا اور تمہارے باپ کا قتل میری رائفل سے نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی دوسری رائفل کی گولی تھی۔"

اس نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میں یقین نہیں کر سکتا۔ تم کرائے کی بندوق بھی حاصل کر سکتے تھے۔ کسی سے تھوڑی دیر کے لئے ہتھیار مانگ کر قتل کرنے کے بعد اسے واپس کر کے چپ چاپ گھر میں آکر بیٹھ سکتے ہو۔ یہ کوئی تمہاری بے گناہی کا ثبوت نہیں ہے۔"

"تو پھر مجھے مہلت دو تاکہ میں اس قاتل کو گرفتار کرا سکوں۔ میں جب تک اصل قاتل کو بے نقاب نہیں کروں گا۔ اس وقت تک اپنے علاقے میں نہیں جا سکوں گا۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دوں گا اور تمہارے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کروں گا۔ تم اپنے علاقے میں واپس چلو' وہیں جا کر تم اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کر سکو گے۔"

کامران شاہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں دلیر خان میں تمہاری زبان پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ دو برس تک تمہارے ساتھ تعلیم حاصل کی ہے لیکن تمہارا بھائی شیر خان نرا جاہل ہے وہ عقل کی بات سمجھنا نہیں چاہتا۔ وہ کسی بھی وقت مجھے ہلاک کر سکتا ہے۔"

"شاہ خاناں! تم کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔ اگر تم نے میرے باپ کو قتل نہیں کیا ہے تو کیا تم بچہ شاہ کی بستی میں رہ کر اصل قاتل کو گرفتار کر سکو گے؟"

کامران شاہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! اگر تم میرے تعاقب میں آ سکتے ہو تو وہ قاتل بھی میرے پیچھے آئے گا۔ وہ چاہے گا کہ میں کسی طرح مار ڈالا جاؤں تاکہ اس کے خلاف کارروائی کرنے والا کوئی موجود نہ رہے۔ تم یقین کرو دلیر خان! اس وقت میں صرف تمہارے جیسے ایک دشمن کی زد میں نہیں ہوں بلکہ دو دو دشمن مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ تمہارے علاوہ وہ قاتل بھی یقیناً اسی بستی میں آ چکا ہو گا۔ یا آئے گا تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

دلیر خان چند لمحوں تک اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر تائید میں سر ہلا کر بولا۔ "تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ اگر تم نے قتل نہیں کیا ہے تو وہ قاتل تمہارے پیچھے ضرور آئے گا۔ تمہیں ضرور ختم کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ ہمارا شبہ یقین میں بدل جائے اور ہم تمہارے مرنے کے بعد بھی تمہیں قاتل سمجھتے رہیں۔ بہرحال! میں تمہیں مہلت دوں گا۔ میں جانتا ہوں تم وعدے کے پکے ہو۔ زبان کے دھنی ہو' مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تک اصلی قاتل کو بے نقاب نہیں کرو گے۔ یہ بستی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ اگر جاؤ گے تو کتابوں سے حاصل کی ہوئی ہماری تمہاری دوستی کو ہمیشہ کے لئے

دشمنی میں بدل دو گے۔"

"دلیر جاناں! میں وعدہ کرتا ہوں کہ صرف میں ہی نہیں' میرا بچہ بھی اس بستی میں اس وقت تک رہے گا جب تک کہ میں اصل قاتل کو بے نقاب نہیں کروں گا۔ میں اور میرا بچہ خاندان کے آخری چشم و چراغ ہیں۔ اسی طرح تم اور تمہارا بھائی شیر خان اپنے خاندان کے آخری افراد ہو۔ اگر میں نے اپنی سچائی ثابت نہ کی تو ہم میں سے کسی نہ کسی خاندان کے چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ جائیں گے۔ میں تمہاری دی ہوئی مہلت سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔"

دلیر خان نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اچھی بات ہے اب میں تم سے ایک ہفتے کے بعد بات کروں گا' خدا حافظ!"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور وہاں سے جانے لگا۔ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کتنے ہی لوگ ان کی تعریفیں کر رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا۔ "دونوں ہی سمجھ دار ہیں۔ ہم میں سے کسی کو بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہاں! کسی صلح صفائی کے بغیر ہی دونوں ایک بات پر راضی ہو گئے ہیں۔ سچ ہے ایک انسان کو اتنی مہلت ملنی چاہئے کہ وہ دوسرے کو سمجھ سکے اور اپنی بات سمجھا سکے۔"

کامران شاہ اپنی رہائش گاہ کے برآمدے میں آیا۔ پھر وہاں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ لیٹی چھجے پر کھڑی ہوئی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے کامران شاہ کو صحیح سلامت دیکھ کر خدا کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ بچہ اب پُرسکون ہے۔

کامران شاہ نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ دشمن سمجھدار ہے اور میری باتیں سمجھ لیتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح اپنی بے گناہی ثابت کر سکوں۔"

لیٹی نے تشویش کا اظہار کیا۔ "اگر آپ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے تو کیا ہو گا؟"

"مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ میرا ساتھ دے گا اور جو مجرم ہے اسے بے نقاب کرے گا۔ یہ ایک ہفتہ اگرچہ اطمینان کا ہے لیکن مجھے شیر خان کی طرف سے اطمینان نہیں ہے۔ وہ جاہل' اجڈ اور گنوار ہے۔ صرف لڑنے مرنے کی باتیں جانتا

ہے۔ سمجھداری اسے چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ بہر حال دیکھا جائے گا۔ آؤ' کمرے میں چلیں۔"

رات کے دو بج رہے تھے۔ دلیر خان اپنی رہائش گاہ کے برآمدے میں آیا۔ پھر وہاں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپری کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے گیا تھا لیکن اسے کھلا ہوا پایا۔ اندر روشنی بھی تھی۔ اس نے باہر سے پوچھا۔ "اندر کون ہے؟"

شیر خان کی آواز آئی۔ "میں ہوں۔ چلے آیئے۔"

وہ دروازے کے اندر آیا تو شیر خان کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ریوالور کی نال سیدھی دلیر خان کی طرف نشانہ لئے ہوئے تھی۔ وہ ٹھٹک کر بولا۔ "یہ کیا ہے؟"

شیر خان نے کہا۔ "آپ دروازہ بند کر دیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کم بخت مادہ پرندہ اس ہتھیار کو دیکھ لے اور میری بوٹیاں نوچنے چلی آئے۔"

دلیر خان نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر پوچھا۔ "یہ ہتھیار اس بستی میں کیسے آیا؟"

شیر خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اسمگلنگ کس ملک میں نہیں ہوتی۔ کس بندرگاہ اور کس سرحد کے آر پار نہیں ہوتی۔ یہ تو پھر بھی بچہ شاہ کی بستی ہے۔ اس کے اطراف نہ تو کوسٹ گارڈز ہیں۔ نہ ہی کسٹم پولیس کے افراد ہیں۔ یہاں یہ ہتھیار چھپا کر لائے جا رہے ہیں اور چوری چھپے خرید کر کتنے ہی گھروں میں رکھے جا رہے ہیں۔ کل صبح ایک بہت بڑا انقلاب برپا ہوگا۔"

دلیر خان اسے ٹٹولتی ہوئی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم اتنی ساری معلومات کہاں سے حاصل کر کے آئے ہو؟ اور وہ انقلاب کیا ہے جو کل برپا ہونے والا ہے۔"

"میں قمار خانے میں اپنا وقت گزار رہا تھا۔ ایسی جگہ سے ایسی معلومات حاصل ہو جایا کرتی ہیں۔ سب ہی لوگ اس مادہ پرندہ کے خلاف ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ ہم سب مرد ہیں اور بچپن سے ہتھیاروں کے ساتھ کھیلتے آئے ہیں۔ ان کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہمیں اپنے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے

کہ کل صبح سورج نکلنے کے بعد ہم چاروں طرف سے اس مادہ پرندے کو گھیر لیں گے پھر اسے شکار کریں گے۔"

دلیر خان نے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔ صرف گولیوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ دنیا کی کوئی سرحد ایسی نہیں ہے جہاں سے ٹینک' گولہ بارود اور بندوق ہٹا دی جائیں اور صرف محبت کا پہرہ بٹھا دیا جائے۔ لوگ اس مادہ پرندے کی ممتا اور محبت کو نہیں سمجھ رہے۔ یہاں کچھ عرصے کے لئے امن وامان قائم رہا۔ مجرموں کو پناہ ملی۔ دشمنوں کے ستائے ہوئے لوگ یہاں آکر محفوظ رہے۔ اب وہی لوگ اس بات پر تلملا رہے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں کیوں نہیں ہیں۔ ایک مادہ پرندے کی دہشت کیوں طاری ہے؟ دراصل اس کی دہشت نہیں ہے۔ بے چاری کی محبت ہے۔ اس محبت کو دہشت کا نام دے کر کل اسے شکار کیا جائے گا۔ یہ نہایت ہی افسوس کا مقام ہے۔"

"آپ اس پرندے کی بات کو جانے دیں۔ یہ بتائیں' کیا........ کامران شاہ سے سامنا ہوا تھا؟"

"ہاں' ابھی ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔"

شیر خان ایک دم سے بپھر کر بولا۔ "کس بات کی مہلت دی ہے؟ کیا آپ کی رگوں میں ہمارے مقتول باپ کا جو لہو ہے وہ گرم نہیں ہوا۔ آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟"

"شیر خان! بات سمجھا کرو۔ وہ قسمیں کھا کر کہتا ہے کہ اس نے ہمارے باپ کو قتل نہیں کیا ہے۔ اس نے مجھ سے مہلت مانگی ہے۔ وہ اصلی قاتل کو بے نقاب کرے گا۔"

"وہ اپنے بچاؤ کی باتیں کر رہا ہے اور آپ اس کی باتوں میں آگئے۔ ہمارے باپ کا اور ہمارے خاندان کا اس کے سوا کوئی دشمن نہیں رہا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ سب ہمارے ملنے جلنے والے ہمارے دوست احباب ہیں۔ کسی سے ہماری دشمنی نہیں ہے۔ کون ہمارے باپ کو قتل کر سکتا ہے۔ صرف کامران شاہ نے ایسا کیا ہے۔"

"ہاں' حالات یہی کہتے ہیں لیکن میں کامران شاہ کو کالج کے زمانے سے جانتا

ہوں۔ وہ جتنا دلیر ہے اتنا ہی زبان کا سچا اور اپنے ارادے کا پکا ہے۔ جب وہ ایک بات کہتا ہے تو میں اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کرلیتا ہوں' میں اسے بارہا آزما چکا ہوں۔ میں نے اس لئے مہلت دی ہے کہ وہ سچا ہے تو اصل قاتل کو بے نقاب کردے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہ یہ بستی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اتنا میں جانتا ہوں۔ پھر ہم ایک ہفتے کے بعد اس سے نمٹ لیں گے۔"

شیر خان نے اپنی جیب سے نسوار کی ڈبیہ نکالی۔ ایک چٹکی نسوار نکال کر اپنی داڑھ میں دبا کر اسے بند کیا۔ پھر یہ بولتا ہوا چلا گیا۔ "انتظار آپ کریں مجھے موقع ملے گا تو میں اسے گولی سے اڑا دوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ دلیر خان تھوڑی دیر تک اس خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب میں دو عدد سگار رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اصلی سگار تھا اور دوسرا نقلی۔ وہ نقلی پنسل ریوالور تھا جو کہ سگار کے خول میں لپٹا ہوا تھا۔ جس وقت وہ کامران شاہ سے گلی میں کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا اس وقت بھی وہ خطرناک سگار اس کی جیب میں تھا لیکن وہ اسے مہلت دے کر چلا آیا تھا۔ اس نے دوسرے سگار کو لے کر پریشانی کی حالت میں سوچا کیا کیا جائے؟ یہ شرافت بچ بچ آدمی کو بزدل اور سمجھدار بنا دیتی ہے۔ سمجھوتے کی راہیں ہموار کرنے کے طریقے بتا دیتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ابھی کامران شاہ کا کام تمام ہو جاتا۔

اس نے سگار کے سرے کو دانتوں سے دبا کر تھوکا۔ پھر اسے سلگانے لگا۔ اس کے بعد ایک گہرا کش لیتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب وہ دھواں چھوڑنے لگا تو اس دھوئیں کے غبار میں اسے شیر خان کی ماں کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس کی سوتیلی ماں تھی اور غصے میں کہہ رہی تھی۔ "دلیر خاناں! تیری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ تو جب سے کتابیں پڑھنے لگا ہے رائفلوں کو چھونا بھول گیا ہے۔ کیا جب کوئی تیرے خاندان کا ایک اور فرد مارا جائے گا' تب تجھے غیرت آئے گی؟"

دلیر خان کا باپ ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا کھانس رہا تھا۔ وہ کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ "دلیر خاناں! میں نے تجھے اس لئے کالج میں نہیں پڑھایا ہے کہ تو بزدل بن جائے اور اپنی خاندانی روایات کو بھلا دے؟"

وہ کھانستا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ آج وہ بولنے والا اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ "جب کامران شاہ مجھے گولی مارے گا تب تجھے عقل آئے گی دشمنوں کو ڈھیل نہیں دینی چاہئے۔ انہیں پہلی فرصت میں گولی سے اڑا دینا چاہئے۔"

وہ بے چینی کی حالت میں سگار کے کش لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا اس نے ڈھیل دی ہے؟ کیا اس کی وجہ سے اس کا باپ مارا گیا ہے؟ اگر وہ پہلے ہی دن کامران شاہ کو گولی سے اڑا دیتا تو آج اس کا باپ زندہ رہتا۔

اس کے جسم میں سختی آگئی۔ اس کی انگلیاں بھی سخت ہو گئی تھیں ان انگلیوں میں سگار ٹیڑھا ہو رہا تھا' ٹوٹ رہا تھا' مڑ رہا تھا' مسلا جا رہا تھا وہ اوپر سے سخت ہو رہا تھا' مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اندر سے تو تعلیم نے اسے مہذب بنا دیا تھا۔ وہ اسی طرح اضطراب میں جتلا ہو سکتا تھا لیکن عقل کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

☆--------☆--------☆

سورج نکل رہا تھا۔ شاہینہ چٹان پر سونے کی عادی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو جاتی تھی۔ پھر سب سے پہلے دور دور تک دیکھتی تھی کہ کوئی رائفل بردار نہ آرہا ہو۔ جب اس نے اٹھ کر دیکھا تو شاید وہ چونک گئی ہو۔ کیونکہ اس کی توقع کے خلاف کچھ رائفل بردار نظر آرہے تھے۔ پہلے ایک رائفل والے کو دور سے ایک جگہ دیکھ کر وہ غصے میں آگئی۔ وہ چاہتی ہی تھی کہ پرواز کرے اور اس پر جھپٹ پڑے لیکن دوسری جگہ اور دو ہتھیار والے نظر آئے۔ پھر تو جیسے جیسے سورج کی روشنی پھیلتی گئی' دور دور تک کوئی رائفل لئے ہوئے' کوئی ریوالور لئے ہوئے نظر آنے لگا۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ اسے نشانہ بنایا جانے والا ہے۔

یہ خواب ہے یا حقیقت! کیا یہ اتنی زہریلی سچائی ہے کہ اس نے یہاں بسنے والوں کو بندوق کی گولیوں سے اب تک محفوظ رکھا اور یہی لوگ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے والے تھے۔ اس نے چٹان کی بلندی سے دیکھا۔ کچھ لوگ ان ہتھیار والوں پر اعتراض کر رہے تھے' انہیں منع کر رہے تھے' انسانیت کا واسطہ دے کر حیوانیت سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی پوزیشن یہ تھی کہ اس بلند چٹان کے بہت نیچے وہ چاروں طرف اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے اور ہتھیار اٹھائے ہوئے شاہینہ کا نشانہ

باندھ رہے تھے۔ اعتراض کرنے والوں میں کامران شاہ بھی تھا اور دلیر خان بھی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگ تھے۔ شیر خان وہاں موجود تھا۔ اس کھڑکی سے اس کھلی جگہ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ سب لوگ اس کی نظروں میں تھے۔ وہ کامران شاہ کو بھی دیکھ رہا تھا۔

وہ ہاتھ میں ریوالور لئے اندازہ کر رہا تھا کہ کامران شاہ اس کی شوٹنگ رینج میں ہے یا نہیں؟ وہاں اب تب میں فائرنگ ہونے ہی والی تھی۔ شاہینہ کی لاش چٹان کی بلندیوں سے گرنے والی تھی۔ اسی وقت شیر خان نے اپنے طور پر صحیح نشانہ لیتے ہوئے گولی چلادی۔ اِدھر ٹھائیں کی آواز آئی اُدھر کامران شاہ تڑپ کر گر پڑا۔

بچہ شاہ کی بستی میں تقریباً تین برس کے بعد گولی چلنے کی آواز پہلی بار سنائی دی تھی۔ شاہینہ نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور چٹان سے بلند ہو گئی۔ اسی وقت ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی لیکن فائرنگ کرنے والے ذرا دیر کر گئے تھے۔ اتنی دیر میں شاہینہ پلٹ کر پیچھے ایک غار کے اندر چلی گئی تھی۔

پرندوں کے احساسات اور جذبات کو سمجھنے والے ماہرین کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت شاہینہ حیران و پریشان ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس پر حملہ کروں' کس کی بوٹی نوچ کر لے جائے؟ کس کو اپنے غصے اور جنون سے سمجھا جائے کہ "بے وقوفو! تم لوگوں نے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ تین برس کے امن و امان کو غارت کر دیا ہے۔ اب تم نتیجہ بھگتو گے' اب ہتھیار آئے ہیں تو قانون بھی آئے گا۔ انتقام لینے والے دشمن بھی آئیں گے۔ اب تمہارے سہمے سہمے رہنے کی باری ہے۔ تم اپنے سرہانے بندوقیں رکھ کر سونا چاہو گے مگر تمہیں نیند نہیں آئے گی۔"

کامران کو زمین پر گرتے دیکھ کر دلیر خان چونک گیا' وہ دوڑتا ہوا آیا۔ پھر کامران کے قریب پہنچ کر اسے زمین پر سے اٹھانے لگا۔ ایسے وقت جب گولیاں چلتی ہوں' کوئی زخمی کے قریب بھی جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں سے دوسری گولی آکر ہمدردی کرنے والے کو نہ چاٹ جائے لیکن دلیر خان جب اس زخمی کے پاس پہنچا تو سب ہی ایک ایک کر کے اُدھر جانے لگے۔ کامران شاہ کو زیادہ گہرا زخم نہیں آیا تھا' گولی اس کی پسلی کو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی اور وہ احتیاطاً تڑپتا

ہوا زمین پر گر پڑا تھا تاکہ دوسری فائرنگ سے محفوظ رہے۔

دلیر خان نے کہا۔ "شاہ خاناں! میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے تم پر گولی نہیں چلائی۔"

کامران شاہ نے تائید میں سرہلا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں تم زبان کے دھنی ہو۔ تم مجھ پر یوں گولی نہیں چلاؤ گے۔ مجھ پر یا تو تمہارے بھائی شیر خان نے گولی چلائی ہے یا پھر وہ قاتل مجھے ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"تمہیں معمولی سی مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ تمہیں ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیں گے۔ میں جاکر معلوم کرتا ہوں کہ کس کم بخت نے یہ حرکت کی ہے جبکہ میں نے تمہیں ایک ہفتے کی مہلت دی ہوئی ہے!"

وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگا۔ شیر خان اوپری منزل کی کھڑکی پر کھڑا ہوا اس بات پر افسوس کر رہا تھا کہ اسے دوسری بار گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔ ایک تو دلیر خان دوڑتا ہوا چلا آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی بھیڑ کامران شاہ کے آس پاس لگ گئی تھی۔ گولی چلانے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

وہ اوپر منزل سے اتر کر نیچے آگیا۔ پھر اس میدانی علاقے کی طرف جانے لگا جہاں ہتھیار لئے ہوئے لوگ اس غار کی بلندی کو دیکھ رہے تھے جہاں شاہینہ جاکر چھپ گئی تھی۔ ایک کہہ رہا تھا۔ "ہمیں اوپر چڑھنا چاہئے۔ اس چٹان پر پہنچ کر غار کے اندر جاکر اسے ہلاک کر دینا چاہئے۔"

لیکن کوئی پہلے جانے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ اِدھر شیر خان اس میدانی علاقے میں پہنچا تو اس سے پہلے ہی لوگ کامران شاہ کو سہارا دے کر کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ شیر خان وہیں کھڑے رہ کر پہاڑ کی بلندی پر اس غار کی طرف دیکھنے لگا۔ اب دو آدمی حوصلہ کر کے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ غار کے قریب پہنچ کر وہ فائرنگ کرنے لگے۔ شاہینہ کی دہشت اتنی بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ غار کے اندر جاکر اسے گولی مارنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے باہر ہی سے فائرنگ کر کے اسے باہر نکالنا چاہتے تھے۔

نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے انہیں جوش دلایا کہ وہ غار کے اندر جائیں اوپر

سے ایک شخص نے کہا۔ "جسے حوصلہ ہے وہ یہاں آکر اس کے اندر جائے۔ یہاں تو اس غار کی گہرائی کا کچھ اندازہ نہیں معلوم ہوتا۔ پتہ نہیں ہم اندر جاکر اندھیرے میں کہاں اسے تلاش کریں گے وہ ہمیں دیکھ لے گی اور ہم پر جھپٹ پڑے گی۔ ہم تاریکی میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔"

پہاڑی کے دامن سے ایک رائفل والے نے کہا۔ "تم دونوں نیچے اتر آؤ۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ سالی کب تک غار کے اندر بھوکی پیاسی رہے گی۔ اسے کچھ کھانے پینے کے لئے باہر نکلنا ہی پڑے گا۔ اسی وقت ہم اسے شکار کریں گے۔"

اسی وقت لبنیٰ کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ دوڑتی ہوئی آرہی تھی اور کامران شاہ کو پکار رہی تھی۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اس کے شوہر کو گولی ماردی گئی ہے۔ وہ بچے کو سینے سے لگائے دونوں بازوؤں میں چھپائے دوڑتے ہوئے چیختے ہوئے فریاد کرتے ہوئے اسی میدانی علاقے میں پہنچ گئی۔

شیر خان نے اس کی چیخ وپکار سے اندازہ لگایا کہ وہ کامران شاہ کی بیوی ہے اور اس کی گود میں اسی دشمن کا بچہ ہے۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی طرف ریوالور تان کر بولا۔ "اچھا تو تم ہی کامران شاہ کی بیوی ہو اور یہ بچہ اس خنزیر کا ہے۔"

لبنیٰ اسے ریوالور کے ساتھ دیکھتے ہوئے ٹھٹک گئی تھی۔ پھر اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اچھا! تو تم نے ہی میرے شوہر کو گولی ماری ہے۔ بتاؤ وہ کہاں ہیں؟ اگر وہ زندہ ہیں تو مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

وہ سفاکی سے ہنستے ہوئے بولا۔ "میں ایک گولی مار کر پہلے تمہارے بچے کو اس کے پاس پہنچاؤں گا۔ پھر تم چاہو گی تو دوسری گولی سے تمہارے شوہر تک تمہیں بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔"

دور کسی نے کہا۔ "تم یہ کوئی دلیری نہیں دکھا رہے ہو۔ ایک عورت اور اس کے بچے پر گولی چلانے کی دھمکی نہ دو۔"

شیر خان نے للکارتے ہوئے کہا۔ "دیکھو لوگو! تم لوگوں میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو آزاد علاقے سے آئے ہیں اور آزاد علاقے کا دستور جانتے ہیں کہ دو دشمن یا دشمنوں کے خاندان جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو کوئی تیسرا ان کے درمیان

نہیں بولتا ہے۔"

وہ چاروں طرف گھومتے ہوئے وہاں کے لوگوں سے کہنے لگا۔ "دیکھو لوگو! یہ میرا اور کامران شاہ کا خاندانی جھگڑا ہے جو نہ جانے کتنے برسوں سے چلا آرہا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اس جھگڑے کو ختم نہ کرسکے۔ یہ جھگڑا ہم آج ہی ختم کردیں گے۔ میں آپ لوگوں سے آخری بار کہتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی نہ آئے۔ اگر کوئی آئے گا تو میں اس سے پہلے ہی اس بچے کو گولی ماردوں گا۔"

وہ پھر بچے کی طرف نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں اس شرط پر اسے چھوڑوں گا۔ اگر اس کا باپ ابھی میرے سامنے آجائے۔"

پھر وہ چیخ چیخ کر کامران شاہ کو آوازیں دینے لگا۔ لبنیٰ نے کہا۔ "لوگو! یہ تم لوگوں نے کیا کیا؟ ہتھیار اس بستی میں کیوں لے آئے؟ دیکھو' اب تمہاری مائیں بہنیں اور بیٹیاں اس طرح گولیوں کا نشانہ بنیں گی۔ تمہارے ننھے ننھے بچے بھی ان ہتھیاروں سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ یہ سب بہانے ہیں کہ ہتھیار حفاظت کرتے ہیں۔ کبھی نہیں آج تک کسی ہتھیار نے کبھی کی حفاظت نہیں کی۔ اگر ایک کی حفاظت کی ہے تو دوسرے کو ہلاک کردیا۔ اتنی سی بات آج تک تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے اس ماتا کی ماری کو بھی غار میں چھپنے پر مجبور کردیا' اس کی جان کے بھی دشمن بن گئے۔ تم کیسے لوگ ہو؟"

شیر خان نے چیخ کر کہا۔ "کامران شاہ! میں تین تک گنتا ہوں اگر تم نہ آئے تو اپنے بچے کو زندہ نہیں پاؤ گے' کامران شاہ............ ایک............"

یہ کہہ کر اس نے پھر بچے کی طرف نشانہ لیا لبنیٰ فوراً ہی ریوالور کی طرف سے گھوم گئی۔ اپنی پیٹھ اس کی طرح کرلی' بچے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ بچہ اب رو رہا تھا۔ شیر خان دوڑتے ہوئے اور اپنی پوزیشن بدلتے ہوئے لبنیٰ کے سامنے آکر پھر بچے کو نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "کامران شاہ! دو............"

لبنیٰ پھر اس کی طرف سے پلٹ کر اپنے بچے کو بانہوں میں چھپاتے ہوئے دوسری طرف گھوم گئی۔ شیر خان پھر دوڑتے ہوئے لبنیٰ کے سامنے آگیا اور بولا۔ "کامران شاہ............"

وہ تین نہ بول سکا۔ اچانک ہی پہاڑی سے شاہینہ کی چیخ سنائی دی۔ سب لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ اسے دیکھ کر پتہ چلا کہ غار کا دوسرا سرا پہاڑ کے دوسری طرف ہے۔ جہاں سے وہ نکل کر پھر پہاڑی کے اوپر آبیٹھی تھی اور وہاں سے لبنیٰ اور اس کے بچے کو دیکھ رہی تھی۔

شیر خان کے تین کہنے سے پہلے ہی اس نے پہاڑی کی بلندی سے پرواز کی۔ چیختے ہوئے شیر خان کی طرف آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں گونجنے لگیں اس پر گولیاں برسائی جارہی تھیں۔ وہ کبھی دائیں طرف، کبھی بائیں طرف مڑتی تھی، پرواز کرتی ہوئی، اپنے آپ کو گولیوں کی زد سے بچاتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ پھر اچانک ہی پرواز ختم ہو گئی۔ ایک گولی آکر لگی تھی۔ وہ پھڑپھڑا کر زمین پر آگری۔ شیر خان نے قہقہہ لگایا۔ یہاں سے وہاں تک کتنے ہی قہقہے گونجنے لگے۔ لوگ محبت کو گولی مار کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

ان کے قہقہوں کے دوران ہی شاہینہ پھڑپھڑائی، بند ہونے والی آنکھوں سے اس نے شیر خان کو دیکھا۔ پھر اپنی زندگی کی آخری تمام قوتوں کو سمیٹ کر اس نے پرواز کی۔ اس کے چاروں طرف بندوقیں تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کس بندوق والے پر حملے کرے گی۔ اتنی بھیڑ میں ایک شیر خان ہی ایسا تھا جو ننھے سے بچے پر گولی چلانا چاہتا تھا۔ یقیناً شاہینہ کی آنکھوں کے سامنے اس کا اپنا بچہ تھا۔ وہ زخمی ماں چیخیں، چنگھاڑتی ہوئی اور پرواز کرتی ہوئی سیدھی شیر خان کی طرف آئی۔ شیر خان نے فوراً ہی گولی داغ دی۔ وہ پھر ایک بار پھڑپھڑائی لیکن گرنے سے پہلے شیر خان کے ایک شانے کو نوچ لیا اس کے بعد زمین بوس ہو گئی۔

شیر خان ایک دم سے بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے پھر فائر کرنا چاہا لیکن ریوالور خالی ہو گیا تھا کیونکہ جب شاہینہ دور سے پرواز کرتی آرہی تھی تو اس نے دوسروں کے ساتھ خود بھی فائرنگ کی تھی اور فائرنگ کے دوران وہ کتنی گولیاں چلا چکا ہے، اس کا حساب اس نے نہیں رکھا تھا۔ ریوالور کو خالی دیکھ کر وہ ایک دم سے گھبرایا اور وہاں سے پلٹ کر بھاگتا چلا گیا۔

لبنیٰ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ شاہینہ کے سامنے دو زانو

ہو گئی۔ وہ بے زبان زمین پر پڑی ہوئی تھی، لہو سے بھیگ رہی تھی۔ اس نے اپنے بچے کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے دوسرے کانپتے ہوئے ہاتھ کو آگے بڑھایا، پھر شاہینہ کو چھو کر دیکھا۔ وہ ساکت ہو چکی تھی۔ اب اس میں جان نہیں رہی تھی۔ اس نے ممتا کا آخری فرض ادا کر دیا تھا۔ لبنیٰ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تب ہی اس بوڑھی دائی نے لبنیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹی! یہاں نہ بیٹھو، وہ دشمن پھر آجائے گا۔ تمہارا شوہر زندہ ہے۔ ایک ڈاکٹر اس کی مرہم پٹی کر رہا ہے۔ تم یہاں سے چلو۔"

وہ بوڑھی عورت لبنیٰ کو وہاں سے لے گئی۔ دوسری طرف شیر خان بدحواسی میں بھاگتا جارہا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر شاہینہ کی دہشت طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی وہ زمین پر سے اٹھ کر پرواز کرتے ہوئے اس کے پیچھے چلی آرہی ہے۔ ایک گلی سے دوسری گلی اور دوسری گلی سے تیسری گلی طے کرنے کے بعد وہ ایک دکان میں گھس گیا اور دروازے سے جھانک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ وہ بزدلوں کی طرح بھاگتا چلا آیا ہے۔

لیکن وہ بھی کیا کرتا؟ شاہینہ نے دہشت اس طرح طاری کی تھی کہ اس کے شانے سے گوشت کی چھوٹی سی بوٹی نوچ لی تھی۔ ایسے میں وہ یہی سوچتا کہ دوسری بار حملہ کر کے وہ اس کے چہرے سے بوٹیاں نوچ لے گی یا پھر اس کی آنکھیں نکال کر لے جائے گی۔ اسی بات سے وہ اتنی دور بھاگتا چلا آیا تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ کارتوس کی پیٹی تو اس کے دوسرے شانے سے لٹک رہی ہے۔ اسے بھاگنے کے دوران اپنے ریوالور کے چیمبر کو بھر لینا چاہئے تھا بہرحال اب وہ کارتوس نکال کر ریوالور کو بھرنے لگا۔ اسی وقت گبرو اور بجھرو اسے تلاش کرتے ہوئے آگئے۔ اس نے پوچھا۔ "تم دونوں کہاں رہ گئے تھے؟"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں بستی میں ایسے ہنگامے ہو رہے ہیں کہ ہم بچتے بچاتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ جہاں دیکھو فائرنگ ہو رہی ہے۔ لوگوں کو ہتھیار ملتے ہی ایک دوسرے کا خون بہانے کا موقع مل گیا ہے۔ پرانی دشمنیاں تازہ ہو گئی ہیں۔"

شیر خان نے کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ مجھے اپنے دشمن کی تلاش ہے۔ کیا تم

نے کامران شاہ کو دیکھا ہے۔"

گبرو نے کہا۔ "شیر خان! تم نے تو ابھی تک کامران شاہ کی صورت ہمیں نہیں دکھائی۔ ہم اسے کیسے پہچانیں گے؟"

"پہچاننا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ میری گولی سے زخمی ہو چکا ہے۔ کسی ڈاکٹر نے اس کی مرہم پٹی کی ہے۔ کسی بھی ڈاکٹر کے ہاں جا کر معلوم کرو۔ پتہ چل جائے گا کہ وہ کہاں زخمی پڑا ہے۔"

جھبرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہاں زخمیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ لاشوں کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

شیر خان نے وہاں سے چلتے ہوئے کہا۔ "میں بڑے خان صاحب کے کمرے میں تم لوگوں سے ملوں گا۔ کسی طرح کامران شاہ کا پتہ ابھی چلا کر آؤ۔"

وہ چلا گیا۔ گبرو اور جھبرو دوسری طرف نکل گئے۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہتھیار لوگوں کو مل گئے تھے۔ وہ بے چاری شاہینہ ماسٹانی ماری گئی جس نے تقریباً تین برس تک انسانیت اور شرافت کا درس دیا تھا۔ وہ اب خاک میں مل گئی تھی۔ اب بستی کے لوگ ایک دوسرے کو خاک میں ملا رہے تھے۔

دلیر خان اپنی رہائش گاہ کے اوپری کمرے میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ دور دور سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے سوچا تھا کہ بچہ شاہ کی بستی ایک ایسی جگہ ہو گی۔ جہاں کامران شاہ سے سہولت سے باتیں کر سکے گا۔ اگر وہ اس کے باپ کا قاتل ثابت ہوا تو انتقام لے سکے گا۔ ورنہ پھر دونوں اپنے وعدے کے مطابق خاندانی دشمنی کو ہمیشہ کے لئے بھلا کر نئی دوستی کا آغاز کریں گے لیکن یہاں تو پانسہ پلٹ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا لوگ پچھلے تین برسوں سے اندر ہی اندر اس بات پر پک رہے تھے کہ ان کے پاس ہتھیار کیوں نہیں ہیں۔ ہتھیار اسمگل ہو رہے تھے اور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔

لیکن انتقام والی بات اٹک کر رہ گئی تھی۔ اسے اپنے دشمن کامران شاہ کی سچائی کا یقین تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ قاتل کوئی اور تھا لیکن کون تھا یہ کیسے پتہ چلے گا کہ اس کے باپ کو کس نے قتل کیا ہے؟ کون ہے وہ قاتل؟

اس نے آہستگی سے سر اٹھایا تو سامنے دروازے پر شیر خان کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ریوالور کی نال دلیر خان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے شانے سے لہو بہتے دیکھ کر دلیر خان نے پوچھا۔ "کیا کامران شاہ نے تمہیں زخمی کیا ہے؟"

وہ غصے سے بولا۔ "اس کی کیا مجال ہے کہ وہ مجھ پر گولی بھی چلا سکے۔ میں اس کا خاتمہ کر دوں گا مگر وہ مجھے نہیں مل رہا ہے۔ میرے آدمی اسے تلاش کرنے گئے ہیں۔ اس کے ملنے تک میں تمہارا ابھی حساب صاف کر دینا چاہتا ہوں۔"

دلیر خان نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب سمجھاتا ہوں سنو! تم کتابیں پڑھ پڑھ کر یہ بھول گئے کہ سوتیلا آخر سوتیلا ہوتا ہے۔ تم نے کتابوں کے منتر سے بابا کا دل جیت لیا تھا۔ بابا کہتے تھے 'میں بے وقوف ہوں اور تم بہت عقل مند ہو اور چونکہ عقل مند ہو' اس لئے وہ تمہیں شہروں میں ٹرک چلانے کے لئے اور بہت سارے ٹرک خریدنے کے لئے پانچ لاکھ روپے دینا چاہتے تھے اسے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بے شک وہ میرا بھی باپ تھا لیکن وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ بہت بیمار رہتا تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا تھا کہ یہ زندہ نہیں بچے گا۔ جب مجھے پتہ چل گیا کہ یہ کسی طرح زندہ نہیں رہے گا تو میں ایک دن اسے حکیم صاحب کا علاج کرانے کے بہانے گھر سے باہر لے گیا۔ پھر میں نے بابا کے بیان کے مطابق عمل کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ گھوڑا جب بوڑھا ہو جائے' بیمار ہو جائے' کسی کام کا نہ رہے تو اسے گولی مار دینا چاہئے۔ لہٰذا میں نے انہیں گولی مار دی اور اس کا الزام کامران شاہ کے سر پر رکھ دیا۔"

یہ سنتے ہی دلیر خان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف جا رہا تھا۔ تب ہی ٹھائیں سے گولی چلی اور دلیر خان کے دائیں شانے کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔ وہ کراہتے ہوئے دائیں شانے کو تھام کر پھر کرسی پر گر پڑا۔ شیر خان نے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ تمہاری جیب میں وہ خطرناک سگار موجود رہتا ہے' جس کے ذریعے تم ابھی مجھ پر فائر کر سکتے تھے۔ میں تمہیں اس بات کا موقع نہیں دوں گا لیکن تمہیں مارنے سے پہلے

یہ بتادوں کہ ماں مجھے باپ کا قاتل نہیں سمجھتی ہے۔ میں نے اس سے بھی یہ بات چھپائی ہے۔ بے شک وہ میری سگی ماں ہے۔ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے لیکن وہ شوہر پرست بھی ہے میرے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اب یہاں سے جانے کے بعد میں بتاؤں گا کہ کامران شاہ نے تمہیں قتل کردیا اور میں نے کامران شاہ کو ٹھکانے لگادیا۔ اس طرح خاندانی انتقام کی آگ جو صدیوں سے چلی آرہی ہے وہ بجھ چکی ہے۔ دشمن کا کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔"

بہت قریب سے کامران شاہ کی آواز سنائی دی۔ "بے شک دشمنوں کو زندہ رہنا بھی نہیں چاہیے۔"

شیر خان ایک دم سے اچھل پڑا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی وقت فائرنگ ہوئی۔ شیر خان کے ہاتھ سے ریوالور گر پڑا۔ کامران شاہ نے دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "دشمنوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ بشرطیکہ یہ فیصلہ ہوجائے کہ دشمن کون ہے۔ میں ہوں' دلیر خان ہے یا تم ہو شیر خان؟ تم نے اور تم جیسے لوگوں نے خاندانی دشمنی کو ہوا دی ہے۔ یہ آگ بھڑکاتے آرہے ہیں جس کے نتیجے میں یہ دشمنی کبھی ختم نہ ہوسکی۔ ہم نے سوچا تھا کہ بچہ شاہ بستی میں امن و امان ہوگا۔ دشمن یہاں ختم ہوجائے گا لیکن یہاں بھی ہتھیاروں کو عام کردیا گیا ہے۔ بے چارہ ایک امن پسند پرندہ بھی مارا گیا۔ دشمن تم ہو اور تمہیں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے شیر خان کو گولی ماردی۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا دلیر خان کے پاس آیا۔ اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "آؤ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔ جب تمہاری مرہم پٹی ہوجائے تو پھر اس نتیجے پر پہنچنا کہ میں نے تمہارے بھائی کو قتل کرکے خاندانی دشمنی کو ہوا دی ہے یا تمہارے باپ کے قاتل کو قتل کرکے اس دشمنی کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا ہے۔ آؤ پہلے ہم زخم پر مرہم رکھنا سیکھیں۔"

☆------ختم شد------☆